محمد بن عبد الوہاب

ایک مظلوم اور بدنام مصلح

مسعود عالم ندوی

مکتبۂ نشاۃِ ثانیہ حیدرآباد دکن

محمد بن عبدالوہاب

ایک مظلوم اور بدنام مصلح

جس میں بارہویں صدی ہجری کے مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت اور دعوت پر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے، اور غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے اور جس میں مشرق و مغرب کے تمام ماخذ کو پوری طرح کھنگال کر اُن پر بے لاگ تنقید کی گئی ہے

تالیف

مسعود عالم ندوی

مکتبۂ نشأۃ ثانیہ چپل گوڑہ حیدرآباد دکن

قیمت (عال) ۸/

اشاعت دوم ستمبر ۱۹۴۷ء تعداد (۱۰۰۰)

مطبوعہ

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ - حیدرآباد دکن

انتساب

اپنے استاذ، مربی اور مخدوم

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

کے نام

جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے اور جن کی سرپرستی اور قیمتی مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور اپنی طالب علمی کے گذشتہ بارہ تیرہ برسوں میں، جن کی ہدایتوں کا یکسر پابند رہا ہوں۔

اس حقیر طالب علمانہ کوشش کو معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں

پٹنہ — خاکسار

۲۰ ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ — مسعود عالم ندوی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

(۱)

قدرت کے کارخانے بھی عجیب و غریب ہیں۔ لکھنے والے نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک تجدید و امامت اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی سرگزشت قلم بند کرنا چاہی اور مرتب ہوگئی، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب کی سیرت۔

اس "عجیب و غریب" واقعے کی مختصر سرگذشت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (رحمہما اللہ رحمۃ الابرار الصالحین المجاہدین من عبادہ) کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے، ایک نے حضرت سید صاحبؒ کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا، ان میں جو باہمت، صاحب دل اور سراپا

اخلاص و جہاد تھا، اُس نے سیرت سید احمد شہید مرتب کر لی (۱۳۹ھ) میرا اشارہ اپنے مخلص دوست مولانا ابو الحسن سید علی حسنی ندوی (استاد تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلما) اور ان کی تصنیف سیرت سید احمد شہید کی طرف ہے جو اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے، اور ایک قلیل مدت میں اس کے دو اڈیشن نکل چکے ہیں۔

دوسرے (راقم) نے بھی اپنا کام شروع کیا، لیکن قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئیں، نشانِ راہ دھندلا ہو چکا تھا، جاننے والے اور دیکھنے والے ابدی نیند سو چکے تھے۔ سننے والوں پر اب تک بہیمیت طاری ہے۔ لیکن قلم کا مسافر اپنی منزل کو نہیں بھولا، تلاش و جستجو کے ابتدائی نمونے مرحوم "الضیاء" (شعبان ۵۴ھ) میں "الحرکۃ الوھابیۃ السیاسیۃ" کے عنوان سے اور "الھلال"، پٹنہ میں "وہابیت ایک دینی اور سیاسی تحریک" کی سرخی کے تحت شائع ہوئے اور مخصوص حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے

دورانِ بحث و تمحیص میں نجد کی وہابی تحریک (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کا ذکر بار بار نظر سے گذرا اور ایسی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں سے دوچار ہوا کہ یارائے ضبط نہ رہا، سب سے بڑی غلط فہمی، جس میں دوست اور دشمن دونوں مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک وہابیت یعنے حضرت سید صاحبؒ کی تحریک تجدید و امامت نجد کی وہابی تحریک ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کا ماخذ ایک، مقصد ایک اور دونوں کے چلانے والے کتاب و سنّت کے علم بردار اور یکساں سرگرم مجاہد تھے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل اٹل ہے کہ ایک کا دوسرے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے یعنی ایک نے دوسرے کی تعلیمات سے بالکل فائدہ نہیں

اُٹھایا۔ دونوں دعوتیں، الگ الگ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے مطابق پھلیں پھولیں۔ اس لئے اصولی اتحاد (یعنے کتاب و سُنّت کی طرف لوٹنے کی دعوت) کے باوجود دونوں پر اپنے اپنے مخصوص مقامی اثرات کی چھاپ بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور جزئیات میں ایک دوسرے سے کافی اختلاف بھی رکھتی ہیں۔

ہم نے ابھی کہا کہ نجد کی تحریک دعوت و تجدید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں نظر سے گذریں، کہ یارائے ضبط نہ رہا اور اسی بے اختیاری میں عاجز نے زیرِ ترتیب کتاب کے دو حصے کر دئے۔ "شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی کی سیرت اور دعوت سے متعلق یہ صفحے، اس مجوزہ کتاب کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری جلد ہندوستان کی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ پر مشتمل ہوگی، جس میں حضرت سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء) سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کی تمام سرگرمیوں، قربانیوں اور خدمات کا گہرا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔"

(۲)

اس سلسلے میں ایک چیز کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ "نجدی وہابیت" یا "ہندوستانی وہابیت" کی تاریخ مرتب کرنے سے ہماری غرض اس بات کی تبلیغ نہیں کہ حق و صداقت انھیں دونوں جماعتوں میں محدود ہیں، یا یہ کہ مختلف ادبی و مذہبی "اسکولوں" کی طرح، ان جماعتوں کو ہم ایک خاص مشرب یا "اسکول" کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان جماعتوں کے بعض سرگرم داعیوں، یا پُرجوش معتقدوں کا ایسا خیال ہو۔ لیکن ہم اس "تحزّب" کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں حد درجہ مُضر سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حق صرف کتاب و سنّت کی پیروی میں ہے، ہم

رشد و ہدایت کو کسی فقہی،[1] مذہبی، یا ملکی جماعت کا اجارہ نہیں سمجھتے۔ یہ نہ نجد کی زر خرید ہے نہ ہندوستان کی۔ اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات واضح اور نمایاں ہیں، جو ان پر ٹھیک ٹھیک چلے گا، وہ ہدایت و فلاح سے شادکام ہوگا۔

نجد اور ہندوستان کی ان دونوں جماعتوں کی تاریخ مرتب کرنے اور اُن کے دھندلے نقوش کے اُجاگر کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے دو مشہور مصلحوں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی سیرت ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ان صدیوں میں صرف یہی دو مُصلح پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ) اور طرابلس میں محمد بن علی سنوسی (۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء - ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) بھی اپنی شانِ تجدید و اصلاح کے لحاظ سے انتہائی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، گو کہنے والے کہیں گے کہ سید صاحبؒ کی دعوت حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی پکار کی آواز بازگشت تھی۔ مگر یہ مان لینے کے بعد بھی سید صاحبؒ کا خاص رنگ اور انفرادی خصوصیات اپنی جگہ پر باقی رہتی ہیں۔ اسی طرح اصلاح و تجدید کے دوسرے رنگ میں سید جمال الدین افغانی (ف ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) اور امیر عبدالقادر جزائری (ف ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء) بھی ایک بڑی جماعت کی عقیدت و محبت کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور بجا طور پر۔

اسی طرح ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ نجد اور ہندوستان کی یہ دونوں جماعتیں معصوم

(۱) یعنی ہم "حق" کو ائمہ اربعہ کی تقلید میں محصور سمجھتے ہیں، نہ دیوبند، ازہر یا ندوہ کے شیوخ اور اکابر کی پیروی میں، اور نہ پیشوائی کو کسی خاندان یا ملک کا موروثی حق خیال کرتے ہیں۔

ہیں اور ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں نہیں ہوئیں۔ اہلِ نجد کے بارے میں تو غلو اور شدت کا شکوہ دوستوں کو بھی ہے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ یہ مخلص جماعتیں تھیں، جو اللہ کے نام پر اٹھیں اور جہاں تک انسانی کوششوں کا تعلق ہے، اعلاء کلمۃ اللہ میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آپ اس نظر سے ان کے کاموں کا جائزہ لیجئے۔ سُنی سنائی باتوں، دشمنوں اور جاہل مولویوں اور صوفیوں کے پروپگنڈے سے متاثر ہوکر غلط رائے قائم کرلینا طالبِ حق کا شیوہ نہیں ہوسکتا:

ہم نے اس کتاب میں "رائے زنی" سے مقدور بھر احتیاط برتی ہے۔ امکانی چھان بین اور زیادہ سے زیادہ مستند ماٰخذ کی بنیاد پر ہم نے حالات و معتقدات کے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، اگر کامیابی ہوئی تو یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے" ورنہ ایک ہیچ میرز طالب علم سے غلطیوں اور فروگذاشتوں کا رہ جانا بعید نہیں۔

آخر میں، اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ نیت و عمل میں اخلاص اور اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

پٹنہ

۸ رجمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۶۱ھ

عاجز

مسعود عالم ندوی

عرضِ مؤلّف

زیرِ نظر کتاب کی ترتیب کا کام عاجز نے شوال ۱۳۵۹ھ (نومبر ۱۹۴۰ء) ہی میں شروع کر دیا تھا، لیکن ملازمت کی مشغولیت کے باعث زیادہ وقت نہ دے سکتا تھا، تاہم آہستہ آہستہ کام ہوتا گیا اور شوال ۱۳۶۰ھ (نومبر ۱۹۴۱ء) میں کتاب کا خاکہ تیار ہو گیا۔ مگر کتابوں کی کمی کے باعث مسودہ مکمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اور جب کچھ لکھا، تو کچھ اور کتابوں کے ملنے پر کافی اصلاح و ترمیم کی ضرورت پڑی۔ پھر بھی انتہائی تلاش و جستجو کے باوجود بعض ضروری اور اہم کتابیں نہ مل سکیں جن کا ذکر مآخذ کے ضمن میں آگیا ہے۔

جن بزرگوں اور دوستوں نے کتابوں کی فراہمی اور اُن کا پتہ دینے میں ہماری مدد کی، ہم اُن کے دل سے شکر گذار ہیں۔ اس سلسلے میں خاص طور پر جناب ڈاکٹر عظیم الدین صاحب، پٹنہ، پروفیسر سید حسن عسکری، پٹنہ، مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی، کلکتہ، مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی، لاہور، ڈاکٹر شیخ محمد عنایت اللہ صاحب، لاہور، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، حیدر آباد، شرف الدین واولادہ بمبئی، مولانا عبد المجید صاحب حریری، بنارس، پروفیسر محمد اکبر ندوی، کلکتہ یونیورسٹی، حکیم حافظ یوسف حسن خان صاحب، بہار شریف (پٹنہ) کا دلی شکریہ ادا کرنا میرے لئے

ایک خوشگوار فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر ان بزرگوں اور دوستوں کی مدد نہ ہوتی، تو متعدد کمیاب اور نایاب کتابوں کا جمع کرنا میرے لئے بہت دشوار ہوتا۔

اس موقع پر ایک نجدی عالم شیخ محمد عمران بن محمد بن عمران (ساکن ریاض، نجد) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جنھوں نے بمبئی میں اس کتاب کی تالیف کا حال سن کر پہلے سلامِ محبت سے یاد کیا، پھر بنارس ہوتے ہوئے پٹنہ تشریف لائے اور دو دن غریب خانہ کو رونق بخشی۔ وہ اوسط درجہ کے لکھے پڑھے آدمی تھے، لیکن شیخ ابن عبدالوہابؒ کے ساختہ وپرداختہ نجد کے ایک فرد وہی اتباعِ سنت، وہی تقویٰ، وہی جوشِ عمل جو اس جماعت کا طرۂ امتیاز سنتے آئے ہیں، کم از کم ہندوستان میں اس درجہ کے اشخاص بہت کم دیکھنے میں آئے — ان سے ہمیں بہت مدد ملی، متاخرین علمائے نجد کے سنین وفات کی تعیین انھوں نے اپنے حافظہ سے کی اور پورے یقین کے ساتھ پھر بھی جہاں کہیں، ہم نے ان کی روایت پر اعتماد کیا ہے، حوالہ دے دیا ہے۔

(ب)

کتاب کے مطالعے کے دوران میں مندرجہ ذیل گزارشیں پیش نظر رہیں، تو راقم کی ممنونیت کا باعث ہوگا۔

(۱) حوالوں میں طوالت سے بچنے کے لئے بسا اوقات صرف مُصنّف کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے، کتابوں کی تعیین مآخذ سے ہو سکے گی۔

(۲) ہجری اور عیسوی سنین کے تطابق کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے، لیکن جہاں ٹھیک ٹھیک دن اور ماہ کی تعیین کے ساتھ تاریخ نہیں معلوم ہو سکی ہے، وہاں ہجری سنہ کے مقابلے میں دو عیسوی سنہ دے گئے ہیں۔

(۱۱) جہاں کہیں "شیخ الاسلام" اور "شیخ" کے لفظ بلا کسی نام کے آئے ہیں، وہاں مراد شیخ محمد بن عبد الوہابؒ ہیں۔ اسی طرح آل الشیخ سے اُن کی اولاد و احفاد مراد ہیں گو اس جماعت کے لٹریچر میں شیخ الاسلام کا لقب عام طور پر امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱۲) عربی اور انگریزی عبارتوں کے ترجمے اور اقتباس میں حرف بہ حرف لفظی ترجمہ کا التزام نہیں کیا گیا ہے، البتہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل کا مفہوم ترجمہ یا اقتباس میں ٹھیک ٹھیک ادا ہو جائے۔

(۱۳) یورپی اعلام کے تلفظ میں غلطی کا امکان ہے۔ اگر کہیں ایسی چوک یا لغزش نظر آئے، تو راقم کو مطلع فرما دیا جائے، تصحیح کسی قسم کی بھی ہو، انتہائی شکریے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

---

(۱)

ذاتی حالات

جزیرۃ العرب مسلمانوں کے دورِ عروج میں

عرب کے ریگستانوں نے گو لیل و نہار کے ہزاروں تماشے دیکھے ہیں، مگر شاید اس تماشے سے بڑھ کر کوئی تماشا نہ ہوگا کہ تاریک ذرّوں نے ایک چمکتے سورج (وجودِ نبوی ؐ) کے پرتو سے روشن ہو کر ساری دنیا کی آنکھوں کو اپنی چمک دمک سے روشن کر دیا، اور خود ان کے گوشہ گوشہ کو مطلعِ انوار بنا دیا اور عین اس وقت جب وہ دشت و جبل اور بحر و بر کو منور کر چکے، خود ایسے ماند پڑ گئے کہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ ان قوموں نے جو اس نور سے منوّر ہوئیں، یہ سمجھا کہ ان ریگستانی ذرّوں کی تابانی کے مقابلے میں ان کی چمک اور تابانی نگاہوں کو خیرہ نہ بنا سکیں گی، اس لئے ان کا تاریک اور ماند ہی رہنا اچھا ہے:-

(سید سلیمان ندوی، معارف، نومبر ۲۶ء)

یوں تو بنو امیّہ کے دورِ حکومت ہی میں حجاز کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، دمشق کے شاطروں نے حرمین کو پیرزادوں کی خانقاہ بنا دی۔ اور پھر ابو مسلم خراسانی کی تلوار نے عربوں کی سیاسی قسمت ہی کا فیصلہ کر دیا (۱۳۲ھ) اور جو عباسی سلطنت اس کے

بل بوتے پر قائم ہوئی، رفتہ رفتہ عجمی شہنشاہی بن گئی، مُعتصم (۲۱۸ھ-۸۳۳ء - ۲۲۷ھ-۸۴۲ء) کے دور میں ترکوں نے زور پکڑا، اور پھر تخت و تاج نے ان کے قدم لئے۔ نزدیک اور دور بیسیوں سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، پر غریب عرب کا اس تگ و تاز میں کوئی حصّہ نہ تھا۔

مسلمانوں کے عروج کی ان صدیوں میں بغداد اور قرطبہ کی علمی درسگاہیں قائم ہوئیں، ازہر (مصر)، زیتونہ (تونس)، اور قرویین (فاس)، کی مسجدوں سے علم و عمل کے چشمے جاری ہوئے۔ ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا، سلیمانِ اعظم (۹۲۶ھ-۱۵۲۰ء - ۹۷۴ھ-۱۵۶۶ء) نے وائنا کی دیوار ہلا دی۔ مغلوں نے ہندوستان کو زیر و زبر کیا لیکن عرب کا شُتربان اپنے صحرا میں آرام کی نیند سوتا رہا۔ عثمانی ترکوں نے حجاز پر صدیوں حکمرانی کی۔ لاکھوں کروڑوں کے چڑھاوے دئے۔ مصر کے خراج کا بیشتر حصّہ حرمین کی خدمت کے لئے وقف رہا۔ مجاوروں اور متولیوں کے لئے بیش قرار وظیفے مقرر کئے۔ پر عرب کی وادی غیر ذی زرع میں کہیں علم کا چشمہ جاری نہ ہوا۔ دفتروں کی زبان ترکی رہی۔ اللہ اکبر!! خلیفۃ المسلمین کی حکومت اور مہبطِ وحی میں غیر قرآنی زبان کا چلن! عبرت کا مقام ہے! اِس ذلیل دنیا اور بادشاہی نے کیا کیا نہیں کرایا؟ ہاں سرکاری زبان ترکی رہی، افسر ترکی رہے۔ رہے عرب تو مزاروں کی مجاوری اور گداگری، یا پھر ایامِ جاہلیت کے نمونے پر لوٹ کھسوٹ اُن کا کام رہ گیا تھا۔

محمد بن عبد الوہابؒ بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مُبتلا ہوگئی، مسلمان کتاب و سُنّت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے ایک اللہ کی جگہ سینکڑوں معبود بنا لئے گئے، مصر میں بدوی و رفاعی، عراق و ہند میں عبد القادر جیلی، مکّہ و طائف میں ابن عباسؓ، یمن میں

ابنِ علوان سے مرادیں مانگی جانے لگیں[1] اور مسلمان ہر شجر و حجر کے آگے جھکنے لگے۔ جب یہ حالت ہوگئی، تو پھر اسی بے آب و گیاہ سرزمین پر پہلے پہل تذکیر و ہدایت کا آفتاب ضوفگن ہوا، اور خاکِ عرب کے وہ ذرّے جو جہل و شرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اُٹھے۔ اور نجد کے چمنستان سے جو اپنے عرار و خزامی[2] کی عطر بیزی کے لئے مشہور رہے، توحید و کلمۂ حق کی ایسی خوشبو پھیلی، جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا کر چھوڑا۔ میری مراد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (رحمہُ اللّٰہُ وَنَوَّرَ ضَرِیحَہٗ) کی ذاتِ گرامی سے ہے، جنھوں نے اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، اور جہاں تک اس مردِ مجاہد کی آواز پہنچ سکتی تھی، اس نے حق و صداقت کا پیغام پہنچایا۔

ابن عبدالوہابؒ کی پیدائش کے وقت دنیائے اسلام کی حالت

یوں تو اسلامی دنیا کا فکری زوال آٹھویں صدی ہجری کے اختتام پر اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ اجتہاد و نظر کے دروازے عرصہ ہوا بند ہو چکے تھے۔ متاخرین کے متون و حواشی اور منہیات علماء کے زیرِ درس تھے۔ عملی حالت اس سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی۔ لیکن بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں یہ انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ غیر مسلم بھی عہدِ صحابہ کے حالات سے اس دور کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے، تو انھیں تعجّب و افسوس ہوتا۔ امریکی اہل قلم اسٹاڈرڈ[(1)]

---

[1] تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد لمحمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی ص۱

[2] نجد کے عرار و خزامی کا ذکر کلامِ عرب میں کثرت آتا ہے محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) نے اپنی تاریخ نجد میں اس سلسلے کی منظومات بہ کثرت نقل کی ہیں (ص ۸-۱۹)۔

(1) The New World of Islam ص ۳۶-۲۵

کے بیان کے مطابق:

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے۔ اور تعویذ گنڈے اور مالائیں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے' اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے' جن کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی۔ کیونکہ اِن جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی طاعت بلاواسطہ ادا نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پسِ پُشت ڈال دی گئی تھی' بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی ...... یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ (مکہ ومدینہ) بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے۔ اور حج جس کو رسول اللہ نے فرائض میں داخل کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی ...... اگر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پھر دنیا میں آتے' تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بُت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔"

ایک غیر مسلم مبصّر کے اس تیار کردہ خاکے میں مسلمانوں کے جو خط وخال نظر آتے ہیں وہ آج بھی بڑی حد تک صحیح ہیں یا نہیں؟ امیر شکیب ارسلان کی رائے ہیں بڑے سے بڑا دقیق النظر عالم بھی بارھویں صدی کے مسلمانوں کی اس سے زیادہ صحیح اور واضح تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔[1]

طولِ کلام اگر بار نہ ہو' تو اپنی بدنصیبی کی مزید داستان ایک دوسرے مغربی مُبصّر

---

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد ا صفحہ ۲۶ (حاشیہ)۔

کی زبانی بھی سن لیجئے :-

"اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کا جوش سرد تھا۔ نام نہاد خلیفہ کی ساکھ گر چکی تھی اور مقبوضہ کے جنوب میں اطاعت تسلیم بھی نہیں کی جاتی تھی۔ یمن ایک صدی پہلے یہ جُوا اپنی گردن سے اُتار چکا تھا۔ مکہ کے اشراف عیسائیوں کی نسبت اپنے سردار کی مخالفت میں زیادہ سرگرمی دکھانے کو تیار تھے۔ یہ کیفیت جو آج دکھائی دیتی ہے، اُس وقت اِس کا احساس بہت کم تھا، اور روحانی مرکز "مکہ" مادی عیش و آرام کا شکار ہو چکا تھا۔ اور تقویٰ و زہد کے علاوہ وہاں ہر چیز کے لئے رواداری موجود تھی۔ حالانکہ ہندوستان میں عیسائیوں کی فتح نگاہوں کے سامنے تھی، اور یورپ میں بھی غیر مسلم طاقتیں ترکوں کا پانسہ پلٹ رہی تھیں، لیکن عرب میں ان واقعات کا بہت کم احساس تھا، اور یہ عام غیظ و غضب جس کا مظاہرہ آج[1] فرانس، برطانیہ اور روس کے خلاف کیا جا رہا ہے، اس وقت بالکل مفقود تھا۔ جہاں غصہ نہیں وہاں جوش نہیں، چہ جائیکہ تبلیغی کوششیں ہوں۔ (خلاصہ یہ کہ اس وقت اسلام کا رُخ تنزل کی طرف تھا، اور یہ تجدد جس کی لہر انیسویں صدی عیسوی میں افریقہ اور چین تک پہونچ رہی، اس وقت اس کی پیش بینی نہیں کی جا سکتی تھی۔"[2]

نجد ابن عبد الوہاب سے پہلے | بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلامی دنیا اور مقامات مقدسہ کا جو حال تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ اوپر کے بیانات سے ہوا ہوگا۔ لیکن جزیرۃ العرب کے

---

[1] سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ کتاب تالیف ہوئی۔

[2] Hogarth: Penetration of Arabia a۲

قلب (نجد) کی حالت اور بھی خراب تھی۔ کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ اہلِ نجد اخلاقی انحطاط میں حد سے گذر چکے تھے، اور ان کی سوسائٹی میں بھلائی، برائی کا کوئی معیار نہیں قائم رہا تھا۔ مشرکانہ عقیدے صدیوں کے تسلسل سے اس طرح دلوں میں گھر کر چکے تھے، کہ ایک بڑا طبقہ انہی خرافات کو دینِ صحیح کا نمونہ جانتا تھا، اور غلط یا صحیح وہ اپنے آباء و اجداد کی روش سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

جبیلہ (وادی حنیفہ) میں زیدؓ بن خطاب کی قبر کی پرستش ہوتی تھی۔ درعیہ میں بھی بعض صحابہ کے نام سے منسوب قبریں اور قبے عوام کی جاہلانہ عقیدت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ وادی غبیرہ میں ضرارؓ بن ازور کا قبہ بدعتوں کی نمائش گاہ بن رہا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بلیدۃ الفدا میں ایک پرانے درخت کے ساتھ جوان مرد اور عورتیں جو سلوک کرتی تھیں، ان کے بیان سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ خلاصہ یہ کہ مایوس عورتیں اولاد کی تمنا میں اس درخت سے ہمکنار ہوتیں۔ نیز درعیہ کے پاس ایک غار تھا، جہاں حد درجہ شرمناک برائیاں ہوتی تھیں[۱]، الخ

---

[۱] نجد کی بدعات کا ذکر تمام تاریخوں میں آتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

(الف) روضۃ الافکار والافہام لمرتاد حال الامام وتعداد غزوات ذوی الاسلام تالیف شیخ حسین بن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) (ص ۱۶-۷)۔

(ب) عنوان المجد فی تاریخ نجد ص ۶ تالیف عثمان بن بشر النجدی (ف ۱۲۸۸ھ) (یہ دو کتابیں تاریخ نجد پر اُم اور اصل کا حکم رکھتی ہیں)۔

(ج) الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ، مرتبہ سلیمان بن سحمان (ص ۹-۱۰) نیز تبرئۃ الشیخین الامامین مؤلفہ سلیمان بن سحمان (ص ۱۶۳۔ ص ۱۶۱)۔

یہ سب کچھ دین اور مذہب کے نام پر ہوتا تھا، اور جو دو چار اشخاص فقہ و حدیث سے بہرہ ور تھے، وہ اپنے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ نہ علمائے نجد و دنیا کے علماء سے الگ تو تھے نہیں! !!

سیاسی حالت اور خراب تھی۔ خانہ جنگی اور بدحالی عام تھی، شمالی نجد (جبل شمر)، قبیلہ طے اور حسا میں بنو خالد کا زور تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عُیینہ کی امارت حسا کے بنو خالد کا اقتدار مانتی تھی۔ درعیہ میں قبیلہ عنزہ کے ... جم رہے تھے۔ درعیہ سے قریب منفوحہ میں دواس کی الگ امارت قائم ہوگئی تھی، نجد کا چھوٹا سا علاقہ چھوٹی چھوٹی[۱۵] ریاستوں میں بٹا ہوا تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) (۵) Arabia (دی ماڈرن ورلڈ سیریز) ص ۵-۴۰، فلبی اور ابنِ سحمان کا ماخذ بھی ابنِ غنام ہی کی کتاب ہے۔

۱۵ فلبی: ص ۷-۶: عرب کے مختلف حصّوں اور خاص کر نجد کا جغرافیہ ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں جیسی صوبہ اور ضلع وار مرتب تقسیم ان کے ہاں نہیں ہے۔ اور نہ موجودہ دور سے پہلے ملک میں کوئی قابلِ ذکر سیاسی وحدت تھی۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ نجد کے تین بڑے بڑے حصّے ہیں:

شمال مغربی حصّہ جس کا نام شمّر ہے، اس کے مشہور شہر حائل اور القصر ہیں،

(۱) شمالی مشرقی حصّہ جس کا نام القصیم ہے، اس کے مشہور مقامات عنیزہ اور بریدہ ہیں۔

(۳) جنوبی حصّہ جو العارض کہلاتا ہے، اس کا مشہور شہر ریاض ہے، جو آج سعودی حکومت کا پایۂ تخت ہے، عارض کو جبل یمامہ بھی کہتے ہیں، اصل میں یہ ایک پہاڑی کا نام ہے، اور اس کے گرد و نواح کی زمین وادی حنیفہ اور یمامہ کہلاتی ہے، شیخ الاسلام کی جائے پیدائش عینیہ اور

خاندان اس پر آشوب دَور اور ناموافق ماحول میں محمد بن عبدالوہاب نے آنکھیں کھولیں۔ عُیَینہ[۱] کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے[۲] (۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء) ان کے جدِ امجد[۳] سلیمان بن علی بن مشرف (ف ۱۰۷۹ء) اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور علمائے نجد کے مرجع و ماوٰی تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) دعوت کا مرکز درعیہ دونوں اسی وادی میں واقع ہیں جو نجد کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: لفظ Arabia جلد ۱ ص ۳۷۱، اور (Najd) جلد ۳ ص ۸۹۳-۶۔

[۱] عُیَینہ (بضم عین) 'عین' (چشمہ کے معنی میں) کی تصغیر ہے۔ اور اب اسے 'بار الشیخ' بھی کہتے ہیں۔

[۲] ابنِ غنام: ج ۱ ص ۳۰؛ عنوان المجد جلد ۱ ص ۱۳۸۔ بعد کے لکھنے والوں میں احمد بن زینی دحلان (الدرر السنیۃ ص ۴۲؛ خلاصۃ الکلام ص ۲۲۹) نے ۱۱۱۱ھ اور امیر شکیب (حاضر جلد ۴ صفحہ ۱۶۱) نے ۱۱۱۶ھ تاریخ ولادت بتلائی ہے، جو غلط ہے اسی طرح Huges (ڈکشنری آف اسلام صفحہ ۶۵۹)، ولفرڈ بلنٹ (اے پلگریمیج ٹو نجد (ضمیمہ) صفحہ ۲۵۱) اور ڈیر Arabia The Cradle of Islam وغیرہم نے تاریخ ولادت ۱۶۹۱ء لکھی ہے جو یکسر غلط ہے۔ ہوگارتھ (ص ۴۳) نے بھی سالِ ولادت غلط (۱۶۹۶ء) دیا ہے اور انھیں ماخذوں کی پیروی میں اپنے بھی ٹھوکر کھاتے ہیں۔

[۳] (الف) شیخ کا پورا نسب نامہ یہ ہے:-

محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن علی بن محمد بن احمد بن راشد بن برید بن مشرف الخ

(ب) السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ) میں اس خاندان کے مندرجہ ذیل افراد کے حالات ملتے ہیں:-

۱۔ سلیمان بن علی بن مشرف (صفحہ ۱۰۳)۔

مناسک میں ان کی کتاب مشہور ہے، اور السحب الوابلہ کے بیان کے مطابق مناسک کے باب میں عام طور پر حنابلہ اسی پر اعتماد کرتے ہیں، (ص ۱۰۳) ان کے چچا ابراہیم بن سلیمان بھی ممتاز عالم تھے۔ ابراہیم کے بیٹے عبدالرحمٰن (ف ۱۲۰۶ھ) بھی فقیہ و ادیب تھے۔ شیخ کے والد عبدالوہاب ابن سلیمان (ف ۱۱۵۳ھ) بھی فقہ میں دخل رکھتے تھے، اور ایک عرصہ تک عُیینہ اور حریملا میں عہدہ قضا پر مامور رہے۔ سلیمان بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) اور ان کے فرزند عبدالعزیز (ف ۱۲۶۳ھ) بھی ممتاز علمی حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۲۳۶ھ میں مصری غارتگری کے وقت وہ حریملا میں موجود تھے، محبوس کئے گئے اور طرح طرح کی سختیوں سے دوچار ہوئے۔ ان کا کتاب خانہ نذرِ آتش کیا گیا، اور مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ (عنوان جلد ا صفحہ ۲۳۶)۔

نشو و نما محمد بن عبدالوہاب آغاز طفولیت ہی سے ذہانت اور قوتِ حافظہ میں ممتاز تھے۔ دس برس کی عمر سے پہلے قرآنِ مجید کے حفظ سے فارغ ہو گئے۔ اپنے والد سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھیں اور بچپن ہی میں حدیث و تفسیر کی کتابیں کثرت سے مطالعہ کیں۔ ان کے والد عبدالوہاب ہونہار لڑکے کی ذہانت اور استعداد سے متعجب ہوتے۔ ان کا بیان ہے کہ محمد کی تدریس کے دوران میں وہ خود بھی اپنے ہونہار بچے کی ذہانت اور وسعتِ معلومات سے مستفید ہوئے۔ شیخ عبدالوہاب اپنے بیٹے کے علم سے اس قدر متاثر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶)۔ ۲۔ ابراہیم بن سلیمان بن علی (ص ۹-۸)۔

۳۔ عبدالوہاب بن سلیمان بن علی، سلیمان بن عبدالوہاب، عبدالعزیز بن سلیمان (ف ۱۲۶۳ھ) ص ۲-۱۷۱۔

۴۔ عبدالوہاب بن عبداللہ بن عبدالوہاب بن مشرف (ف ۱۱۲۵ھ) ص ۱۷۲۔

تھے، کہ نو عمری کے باوجود انھیں امامت کے لئے آگے بڑھاتے۔ کم سنی ہی میں شادی ہوئی، اور فریضۂ حج سے مشرف ہوئے۔ مدینہ منوّرہ میں دو ماہ قیام کے بعد عُیینہ واپس ہوئے، اور اپنے والد ماجد سے تحصیلِ علم میں مصروف ہوگئے۔ یادداشتیں اور علمی کتابیں نقل کرنے میں اتنی محویت ہوئی کہ ایک ایک نشست میں بیس بیس صفحے لکھ جاتے۔[۵۱]

علم کی راہ میں | ابن عبدالوہابؒ قدرت کی طرف سے غیر معمولی حسّاس دل لے کر آئے تھے۔ اپنے اردگرد نجد کے شہروں اور بستیوں کی حالت دیکھ دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوتے۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، خود اہلِ علم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ محمد اپنے والد عبدالوہاب سے، جو نجد کے علماء میں ممتاز تھے، جو کچھ حاصل کر سکتے تھے، اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن ہونے والے مصلح اور مجدّد کی پیاس دو چلّو پانی سے کس طرح بجھ سکتی تھی؟ حج سے مشرف ہو چکے تھے، حجاز کی مرکزیت دل میں گھر کر چکی تھی۔ طلبِ علم کا خیال آتے ہی حجاز کا ارادہ ہوا، پُرجوش نوجوان کی عمر کوئی بیس برس کی ہوگی، کہ لیلائے علم کے شوق میں اُس نے دشت نوردی کی ٹھانی اور حجاز کا رُخ کیا۔[۵۲]

دوبارہ حج بیت اللہ اور مسجدِ نبوی کی زیارت سے مشرف ہو کر علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیلِ علم میں منہمک ہوگئے۔ خاص طور پر نجد کے مقام مجمعہ کے ایک مشہور عالم عبداللہ ابنِ ابراہیم بن سیف (جو جوارِ رسولؐ میں جا کر بس گئے تھے) کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔

شیخ عبداللہ بن ابراہیم نجدی (مدنی)[۵۳] کی جلالتِ قدر اور اخلاص کا اندازہ اس

---

۵۱ ابن غنام: صفحہ ۳۰۔ ۵۲ یہ تقریباً ۱۱۳۵ھ کا واقعہ ہے۔

۵۳ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف اپنے وقت کے مشہور فقیہ تھے، شام جا کر مشہور حنبلی عالم

روایت سے ہوتا ہے جو خود شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی زبانی منقول ہے۔ شیخ کہتے ہیں:-

"میں ایک دن ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کہ انھوں (عبداللہ بن ابراہیم) نے فرمایا "تمھیں وہ ہتھیار دکھاؤں، جو میں نے اہلِ مجمعہ کے لئے تیار کیا ہے"؟ میں نے کہا "ضرور"۔ تو مجھے وہ ایک کمرے میں لے گئے، جہاں کتابوں کا انبار تھا، اور بولے "ہم نے اِن لوگوں کے لئے یہی ہتھیار فراہم کئے ہیں"۔ (عنوان صفحہ ۷)۔

شیخ عبداللہ بن ابراہیم ہی کے توسط سے شیخ محمدؒ حیات سندھی[۵۱] (ف ۱۱۶۵ھ) سے تعارف حاصل ہوا جو اس وقت مدینۃ الرسول میں حدیث وسنت کے مسلّم استاذ تھے۔ ابن عبدالوہابؒ ان کے مخصوص شاگردوں کے حلقہ میں داخل ہو گئے اور عرصہ تک خدمت میں حاضر رہے۔ اِسی سلسلہ میں شام کے نامور عالم شیخ علی داغستانی (ف ۱۱۹۹ھ) سے بھی ابن عبدالوہاب کی شاگردی کا ذکر کیا جاتا ہے جو قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا[۵۲]۔ اسی طرح مدینہ منوّرہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) شیخ ابوالمواہب حنبلی (ف ۱۱۲۶ھ) سے استفادہ کیا۔ ان کے بیٹے ابراہیم بن عبداللہ بن ابراہیم (ف ۱۱۸۵ھ) بھی مشہور عالم تھے۔ ان کی کتاب العذب الفائض فی شرح العقیۃ الفرائض، مشہور ہے (السحب الوابلۃ: صفحہ ۱۲-۱۱)۔

۵۱ عنوان المجد: ۱/ ۲۵، سلک الدرر: ۴/ ۳۴)۔

۵۲ شیخ علی داغستانی اپنے عہد کے علمائے دمشق میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ایک عرصہ تک قیام پذیر رہے۔ شیخ محمد حیات سندھی سے روایتِ حدیث کی۔ اور بیسیوں ان سے مستفید ہوئے۔ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے، مدینۂ منورہ تحصیل علم کو آئے اور ایک مدت وہاں قیام پذیر رہے۔ ۱۱۵۰ھ میں لوٹ گئے (سلک الدرر جلد ۳ صفحہ ۲۱۵) شیخ کے زمانۂ قیام مدینہ منورہ میں ان کی عمر بہت کم رہی ہوگی اس لئے اُن سے شیخ کا مستفید ہونا قرینِ قیاس نہیں معاصرین

مشہور محدث محمد بن سلیمان کردی مدنی (ف ۱۱۹۴ھ) سے بھی استفادہ کا ذکر بعض تاریخوں میں آتا ہے، لیکن مستند اور معاصر تاریخوں کی خاموشی کے علاوہ سنین اور واقعات بھی اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں[1]،

استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ (سلاطین نجد کا مذہب، معارف نومبر ۱۹۲۴ء) نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) اور شیخ الاسلام دونوں کا منبع فیض ایک (مسجد نبوی) بتایا ہے۔ اصلی سرچشمہ (کتاب و سنت) کے اتحاد کے ساتھ ساتھ درس گاہ (مسجد نبوی) کے ایک ہونے میں بھی شبہ نہیں، لیکن استاد کی شرکت کا پتہ نہیں چلتا۔

لبیب بتنونی (الرحلۃ الحجازیۃ: صفحہ ۸۷) نے مکہ مکرمہ میں تحصیل علم کا ذکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) بن محب الدین خطیب (الزہراء: رجب ۱۳۴۵ھ) اور محمد حامد فقی (اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی الاصلاح الدینی: ص۱۷) نے اس کا ذکر کیا ہے۔

[1] ابن غنام اور ابن بشر نے محمد بن سلیمان کردی کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ صرف احمد زینی دحلان (الدرر السنیۃ: ۴۲، ۳۵) نے شیخ کردی کی شاگردی کا ذکر کیا ہے اور بڑے زور و شور سے، دحلان کی اس کتاب اور خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام میں اس درجہ غلط بیانیاں بلکہ افترا پردازیاں ہیں کہ اس غیر معتبر روایت پر بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مزید یہ کہ سنین کی شہادت بالکل خلاف ہے۔ محمد بن سلیمان کردی ۱۱۹۴ھ میں سرسٹھ سال کی عمر پاکر فوت ہوئے (سلک الدرر: ۴، ۲-۱۱۱) تو گویا ان کی ولادت ۱۱۲۷ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی اس طرح یہ شیخ کے زمانہ تحصیل میں یہ بھی بالکل نوعمر ہوں گے اور ان سے شیخ کا مستفید ہونا بالکل قرین قیاس نہیں۔

کیا ہے، لیکن کسی مستند روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

مدینہ منورہ سے شیخ نے بصرہ کا قصد کیا۔ اور وہاں شیخ محمد مجموعی سے حدیث و لغت کا درس لیا، اور ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے۔ ابنِ بشر نے اپنے استاذ عثمان بن منصور ناصری سے روایت کی ہے کہ شیخ محمد مجموعی کی اولاد بھی علم و عمل میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی[۱]۔ شام[۲] کا بھی ارادہ رکھتے تھے، لیکن زادِ راہ کی کمی کے باعث کامیاب نہ ہوئے۔ اور احسا ہو کر حریملا (نجد) لوٹ آئے، جہاں اُن کے والد ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں عُیَینہ سے منتقل ہوچکے تھے۔

دعوت و تبلیغ ابنِ عبد الوہاب بچپن ہی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف مائل تھے۔ ابھی وہ عُیَینہ میں فقہ و حدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے، کہ بدعات ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے، اور جہاں کوئی عمل اصولِ دین کے خلاف پاتے فوراً 'نہی عن المنکر' کے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے۔

مدینہ منورہ میں محمد حیات سندھی اور علی بن ابراہیم بن سیف نجدی سے استفادہ

---

۱ عنوان المجد: صفحہ ۸۔

۲ مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ۴، ۹[illegible]-۱[illegible]) نے تو افترا پردازیوں کی انتہا کردی ہے، وہ کہتا ہے:-

"بغداد میں شادی کی جو دو ہزار دینار چھوڑ کر مری۔ . . . . . . کردستان ہمدان قم اصفہان کی زیارت کی اور قیام کیا۔"

اس کے علاوہ A brief History of Wahhabys کے Brydges میں اور Hughes (صفحہ ۶۵۹)، زویمر (صفحہ ۱۹۲)، پالگریو (صفحہ ۳۶۳-۴) میں سے کسی نے سفرِ بغداد،

کے بعد حدیث پر نظر ہوئی، اور پھر چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو انھیں دنیا گمراہی کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے، شیخ نے سب سے پہلے اسی زمانہ میں "استغاثہ" کے خلاف آواز بلند کی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کے پاس جاہلوں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ان سے ضبط نہ ہوسکا۔ ایک مرتبہ وہ حجرۂ نبوی کے پاس کھڑے تھے، اور سامنے بدعات کا بازار گرم تھا۔ اتنے میں ان کے استاذ محمد حیات سندھی آگئے، شیخ نے پوچھا: "ان لوگوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟" استاد نے جواب دیا: اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱)۔

بصرہ میں یہ جذبہ اور تیز ہوگیا۔ نہی عن المنکر بلا خوف کرتے، جس کی پاداش میں انھیں طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنا پڑیں۔ اور آخر بصرہ چھوڑنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ان سے تعلق اور ہمدردی کے جرم میں شیخ محمد مجموعی کو بھی ستایا گیا۔ بدبختوں نے انھیں ٹھیک دوپہر کے وقت نکالا۔ بیچارے اسی حال میں زبیر (۲) کی طرف جا رہے تھے کہ راستے ہی میں پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑگئے۔ آخر ایک باخدا انسان ابو حمیدان نامی نے (جو کرایہ کے گدھے رکھتا تھا) دستگیری کی اور پیاس بجھائی، نیز اپنے گدھے پر سوار کر کے زبیر پہنچا دیا (۳)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱)۔ کسی نے سفرِ دمشق اور کسی نے دونوں کا ذکر کیا ہے، لیکن واقعہ یہی ہے۔ کہ شیخ الاسلام کو بصرہ سے آگے جانے کا موقع نہ ملا، بغداد، شام یا مصر کے سفر کا کوئی ثبوت نہیں۔

(۱) عنوان المجد صفحہ ۷۔ (۲) زبیر: بصرہ سے قریب ایک قصبہ ہے جو حضرت زبیر بن عوام کے نام پر آباد ہے اس کے باشندے اس وقت بھی اتباعِ سنت میں ممتاز ہیں۔

(۳) عنوان المجد: صفحہ ۸۔

یہ سب دعوت کی ابتدائی منزلیں تھیں اور تمہیدی کام تھے۔ حرمیلا واپسی کے بعد انھوں نے بدعات کے استیصال اور توحید و اخلاق کے عام کرنے کا مُصمّم ارادہ کرلیا۔ دعوت کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی۔ اور عبادت کسی قسم کی ہو، صرف اللہ تعالے کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے پر زور دیا۔ کلمہ لاالٰہ الا اللہ کا بول بالا' ان کا شعار تھا۔ صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کوئی بچّوں کا کھیل نہیں۔ وہ بدوؤں سے چوری، رہ زنی، مکاری، لوٹ مار کی بُری عادتیں چھڑا کر ان میں راست بازی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جاہلوں کے غلط عقیدوں کی اصلاح، معبودانِ باطل، قبہّ و قبر سے ہٹا کر پھر معبود حقیقی کی درگاہ میں لا کھڑا کرنا ان کا مقصود تھا۔ پر یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لئے ایمانِ خالص اور سچّی عزیمت کی ضرورت تھی۔ اس راہ میں شیخ کو جن صبر آزما مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا اور جس خندہ پیشانی کے ساتھ انھوں نے اس راہ کی تکلیفوں کا استقبال کیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اوصاف سے پوری طرح متصف تھے۔

توحید کی دعوت دی' غیر اللہ کے آگے سر خم کرنے، قبروں ولیوں سے مدد مانگنے، نیکوکار بندوں کو معبود ثانی بنانے سے روکنے کی کوشش کی۔ قبروں کی زیارت میں مسنون طریقہ کے خلاف جو بدعتیں رائج ہوگئی تھیں، ان کے مٹانے کو عملی قدم اُٹھایا۔ بس پھر کیا تھا' مخالفت کا سیلاب امنڈ آیا۔ اعزہ و اقربا درپے آزار ہوگئے۔ خود باپ کو بھی یہ ادا پسند نہ آئی شیخ نے باپ کے ادب اور استاذ کی عزت کا پورا لحاظ رکھا' پر جو قدم آگے بڑھ چکا تھا' وہ پیچھے نہ ہٹا۔ ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی' پر صبر و عزیمت کا کوہِ وقار اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود انھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا' اور عارض کے تمام

قصبات حریملا، عُیینہ، درعیہ، ریاض وغیرہ میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ اور تعلیمات کی اشاعت ہونے لگی۔

تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا، لیکن والدِ ماجد کی سرد مہری[۵۱] کے باعث رفتار سست تھی۔ سنہ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں والد کا انتقال ہوا، تو پھر دعوت و تبلیغ میں گرمی پیدا ہوگئی۔ علی الاعلان اتباعِ سنت اور ترکِ بدعات کا وعظ کہنے لگے، حریملا کے کچھ لوگ متاثر ہوئے، اور تحریک کے پُرجوش معاون بن گئے، شیخ کے درس میں حاضر ہونے لگے، اوران کے مواعظ سے مستفید ہوئے، شیخ کی مشہور تالیف کتاب "التوحید" اسی دوران میں تالیف ہوئی[۵۲]۔

عُیینہ میں سنہ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء دعوت و تبلیغ کی ابتدائی منزلیں طے کرنے پر شیخ کو احساس ہوا کہ اس افراتفری میں، کہ ہر ناحیہ[۵۳] کا حاکم الگ ہے، کامیابی دشوار ہے۔ خود حریملا میں دو خاندان (قبیلہ) سرداری کے لئے دست گریباں تھے[۵۴]۔

---

۵۱ محمد حامد فقی (صفحہ ۵۱) نے شیخ عبد الوہاب کو غیر جانبدار بتایا ہے۔

۵۲ روضۃ الافکار: صفحہ ۳۔

۵۳ عثمانی حکومت کے دور میں انتظامی آسانی کے خیال سے ملک کی تقسیم ان چار حصوں میں کی جاتی تھی۔

ولایۃ (صوبہ) لواء (کمشنری) قضاء (ضلع) ناحیہ (تحصیل) (سب ڈویژن) عارض کا شمار ناحیۃ میں تھا۔ آلوسی نے 'ناحیۃ العارض' لکھا ہے، (صوبہ اور ضلع کی دیسی اصطلاحیں ہم نے مقابلہ کے لئے دی ہیں۔)

۵۴ عنوان المجد (صفحہ ۹) میں بعض غلاموں کی شرارت کا ذکر ہے، جو شیخ کے قتل کا ارادہ

اِن حالات میں کوئی مؤثر قدم اٹھانا مشکل تھا۔ انھوں نے پورے نجد کو ایک امیر اور ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ سمجھتے تھے، کہ کسی امیر (حاکم صاحبِ نفوذ و قوت) کی ہمدردی حاصل کئے بغیر دعوت کو دور و نزدیک جلد از جلد پھیلانا آسان نہیں۔ ان خیالات کے پیشِ نظر انھوں نے عثمان بن معمر امیر عُیَینہ سے خط و کتابت کی۔ اور امیر کو قبولِ حق پر آمادہ پاکر خود بھی عُیَینہ منتقل ہو گئے۔ امیر نے اچھی طرح آؤ بھگت کی اور شیخ کو سر آنکھوں پر بٹھایا، جوہرہ بنتِ عبد اللہ بن معمر سے شیخ کی شادی ہوئی، جس سے ظاہری طور پر تعلقات زیادہ مستحکم ہو گئے۔ شیخ کے سامنے ایک متعین مقصد تھا۔ ذاتی اور خاندانی تعلقات حصولِ مقصد کا ذریعہ ہو سکتے تھے، خود مقصد نہیں تھے۔ انھوں نے امیر عُیَینہ کے سامنے دعوت پیش کی، توحید کا مفہوم واضح کیا اور اس جلیل القدر مہم میں امداد و تعاون کی درخواست کی۔ شیخ کے یہ الفاظ یادگار اور قابلِ نقل ہیں:[1]

انی ارجو ان انت قمت	اگر تم لا الٰہ الا اللہ کی امداد کو آمادہ
بنصر لا الٰہ الا اللہ ان	ہو جاؤ تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ
یظہرک اللہ تعالیٰ و	تمھیں غالب کریگا اور نجد اور اہلِ نجد کی
تملک نجدا و اعرابہا	باگ تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔

عثمان کو یہ پیشکش صدقِ دل سے کی گئی تھی، پر افسوس کہ وہ اس پر قائم نہ رہا، جس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑا۔ اور آخر کار یہ نعمت عُیَینہ سے درعیہ منتقل ہو گئی۔ بہرحال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) رکھتے تھے، دوسری کتابوں میں جہاں کہیں بھی اس کا ذکر ہے، غالباً ماخذ یہی ہے۔

[1] عنوان: صفحہ ۹۔

عثمان بن حمد بن معمر نے امداد کا وعدہ کیا، اور اس کی معاونت کے سہارے شیخ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کھلم کھلا دعوت دینا شروع کی، اور رفتہ رفتہ اہلِ عُیینہ کے دل قبول حق کی طرف مائل ہوتے لگے۔

شیخ نے اس اثناء میں بدعات کے بعض اڈوں کے ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس علاقہ میں بعض درختوں کی توقیر کی جاتی تھی، انھیں بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا۔ زید بن خطابؓ (جو یوم یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے نام سے مقام جبیلہ میں ایک قبر تھی، اور اس پر قبہ، اس کا بھی خاتمہ کیا، جو اس وقت کے لحاظ سے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ابنِ بشر اس قُبہ کے انہدام کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے:

> شیخ نے عثمان سے کہا: "آؤ، اب اس قبہ کو منہدم کردیں جس کی بنیاد باطل پر رکھی گئی ہے، اور جس کی وجہ سے لوگ راہِ ہدایت سے بھٹک گئے ہیں"۔ عثمان نے کہا: آپ ہی اسے ہدم کردیں"۔ شیخ نے فرمایا کہ "ہمیں اہلِ جبیلہ سے خطرہ ہے، کہیں وہ ہمارے درپے آزار نہ ہوجائیں، آپ کی موجودگی کے بغیر میں ہدم نہیں کرسکتا"۔ اس پر عثمان چھ سو آدمیوں کے ساتھ چلا، قریب پہنچنے پر اہلِ جبیلہ نے بزور روکنے کا ارادہ کیا، لیکن جب انھوں نے عثمان کی طرف سے بھی پوری تیاری دیکھی تو ہٹ گئے۔ اس پر عثمان نے شیخ سے کہا کہ "ہم قبہ کو چھو نہیں سکتے"۔ اس پر شیخ نے ہتھوڑا (فاس) لیا اور اپنے ہاتھ سے قبہ کو گرا کر زمین کے برابر کردیا، اور کامیاب واپسی ہوئی۔ اس رات کو اطراف ونواح کے جاہل بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے، کہ دیکھیں اس "ناروا اقدام" سے شیخؒ پر کیا مصیبت آتی ہے لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، جب صُبح ہوئی تو لوگ بہت

مایوس ہوئے اور اہلِ حق کی ہمت بندھی۔ نیز کمزوروں کے ایمان میں تازگی آئی[1]۔"

یہ صرف ایک واقعہ کی تفصیل تھی۔ وہاں قدم قدم پر یہی دشواریاں تھیں، جاہلوں سے لے کر علماء اور مشائخ تک سب کے سب بدعات کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ ابنِ عبدالوہاب کی آواز اور کوشش تھی، جس نے صدیوں کی تاریکی اور گمراہی کے بعد حق کا بول بالا کیا اور صحیح اسلامی تعلیم سے خلقِ خدا روشناس ہوئی۔

شیخ نے امیر عثمان بن معمر کو نماز باجماعت کے احیاء کی بھی تاکید کی اور متخلفین کے لئے سزائیں تجویز ہوئیں۔ حکام طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتے تھے، شیخ نے تمام ٹیکس اڑا دیئے اور صرف زکوٰۃ کا اجرا کیا۔ شیخ نے قیام عیینہ کے دوران میں ابنِ معمر کے ہاتھ سے یہ دو کام اچھّے کرائے، لیکن ان کے دشمن اس میں بھی حرف نکالتے تھے۔

شیخ نے عیینہ ہی میں اپنے تبلیغی رسالوں کا سلسلہ شروع کیا، جو مرتے وقت تک جاری رہا، درعیہ میں ان کے ماننے والے کچھ پیدا ہو گئے تھے، انہی کے نام آپ نے عیینہ سے ہدایت نامے جاری کئے تھے[2]۔

عُیَینہ سے اِخراج عُیَینہ میں کامیابی قدم لینے کو تھی اور اصلاح کی مہم مکمل ہوتی جا رہی تھی کہ قدرت نے ایک شر پیدا کیا، جس میں ہزاروں برکتیں پنہاں تھیں:

"ہونے والی بات، ایک عورت شادی شدہ گناہ کی مرتکب ہوئی اور اس نے شیخ کے سامنے گناہ کا اعتراف بھی کر لیا۔ بار بار جرح کرنے پر بھی وہ اپنے اقرار سے نہ

---

[1] عنوان المجد: صفحہ ۱۰-۹

[2] روضۃ الافکار: ۱: ۲۰۰-

بھری۔ مجبوراً شیخ نے سنگ ساری کا حکم دیا، عثمان بن معمر نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ یہ فرض انجام دیا، سب سے پہلا شخص جس کا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھا، وہ عثمان تھا۔"[۱]

اس "غیر متوقع حادثہ" نے اطراف و جوانب میں تہلکہ پیدا کر دیا۔ خصوصیت کے ساتھ اُن حلقوں میں جو بُرائیوں کے خوگر تھے اور زیادہ کھلبلی مچی۔ بات لگانے والے سلیمان بن محمد عزیز الحمیدی (حاکم احسا و قطیف) کے دربار میں پہنچے اور اسے شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ یہ شخص نہایت رنگیلا اور آوارہ مزاج تھا۔ رجم کے واقعہ سے اس کا برہم ہونا لکل متوقع تھا، کہنے والوں نے اس سے کہا کہ یہ شخص ابن عبد الوہاب تمھاری آزادیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بات لگتی ہوئی تھی، اس کے دل میں جم گئی۔ اُس نے فوراً عثمان بن معمر امیر عُیینہ کو تہدید آمیز انداز میں لکھا:

"یہ مطوع[۲] جو تمھارے ہاں مقیم ہے، اس نے ایسے ایسے ...... کام کئے ہیں، اُسے قتل کرو، ورنہ تمھیں ہمارے ہاں سے جو کچھ ملتا ہے، وہ سب روک دیا جائیگا۔"

چونکہ وہ رقم کافی تھی، (یعنے مال و متاع کے علاوہ بارہ سو دینار سالانہ)۔ اس وجہ سے وہ ایسا متردد ہوا کہ دنیا کی طمع، توحید کی حمایت پر غالب آنے لگی ابھی اس کا سینہ دعوتِ توحید کا محرم نہیں بنا تھا، نہ اُسے یہ معلوم تھا کہ حق کا ساتھ دینے والوں پر غیب سے کیا کیا

---

[۱] روضۃ الافکار: ۲/۳-۲؛ عنوان المجد: ۱۰۰۱۔

[۲] اہل نجد کی زبان میں مولوی اور فقیہ کو مطوع کہتے ہیں، جمع مطاوعہ استعمال ہوتی ہے سوحدین کی نئی منظم برادری اخوان میں بھی مبلغوں کی جماعت مطاوعہ کہلاتی ہے۔

انعامات ہوتے ہیں؟ اسی حیص بیص میں اس نے شیخ کو سلیمان حاکم احساء کے پیام کی اطلاع دی۔ شیخ نے اُسے تسلّی دینا چاہی اور پورے یقین کے ساتھ اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ابنِ بشر کی زبانی شیخ کے یہ الفاظ سننے کے لائق ہیں:

اِنّ ھٰذا الذی انا قمت	میں جو اس چیز کو لے کر کھڑا ہوا ہوں
به ودعوت الیه کلمة لا الٰہ	اور اس کی دعوت دی ہے وہ کلمۂ
الله وارکان الاسلام والامر	لا الٰہ اِلّا اللہ، ارکان اسلام اور
بالمعروف والنھی عن المنکر	امر بالمعروف ونہی عن المنکر (کی دعوت)
فان انت تمسکت به ونصرته	ہے، اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو اور
فان الله سبحانه یظھرك	اس کی مدد کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں
علی اعدائك فلا یزعجك	تمہارے دشمنوں پر غالب کرے گا،
سلیمان ولا یفزعك[1] ... الخ	سلیمان کی وجہ سے تمہیں پریشان ہونے

اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

شیخ نے ہر طرح کوشش کی، پر جب زوالِ دنیا کا خوف قلب پر طاری ہو جائے تو پھر کوئی فہمائش کام نہیں کرتی۔ شیخ کی مؤثر اور پُر امید نصیحت سے پہلی مرتبہ تو وہ رک گیا لیکن پھر اس سے نہ رہا گیا، اور شیخ کے پاس دوبارہ کہلا بھیجا:

"سلیمان نے ہمیں آپ کے قتل کا حکم دیا ہے اور ہم ہیں اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں نیز یہ ہماری مروت سے بعید ہے کہ آپ کو اپنے گھر میں تہ تیغ کریں۔ اس لئے آپ آزاد ہیں ہمارا علاقہ چھوڑ دیں۔" (عنوان صفحہ ۱۱)۔

---

[1] عنوان المجد: صفحہ ۱۰۰۔

یہ پیام دیا' اور اپنے ایک سپاہی فرید الظفیری کی ہمراہی میں عُیینہ کے حدود سے باہر کر دیا۔ اس "اخراج" کی داستان بھی عبرت انگیز اور پُر درد ہے۔ ریگستانِ عرب کی سخت دھوپ، شیخ آگے آگے پیادہ پا' ہاتھ میں صرف ایک پنکھا' اور پیچھے پیچھے فرید گھوڑے پر سوار' ابن بشر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ابن معمر نے درپردہ شیخ کے قتل کا بھی حکم دے دیا تھا۔ شیخ آگے آگے من یتق الله یجعل له مخرجاً ویرزقه من حیث لا یحتسب کا ورد کرتے ہوئے چلے جاتے تھے' سپاہی نے راستہ میں بات نہیں کی۔ جب اُس نے قتل کا ارادہ کیا' تو خود اس کے بیان کے مطابق کسی غیبی طاقت نے اس کا ہاتھ روک لیا' اور اس پر رعب طاری ہو گیا۔ اور اسی عالم میں وہ اُلٹے پاؤں عیینہ کی طرف واپس ہو گیا' صداقت کا اُس پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ سچ مچ اُسے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔

درعیہ میں: ۱۱۵۷ھ | ابنِ معمر کے حدود سے نکل کر شیخ نے درعیہ کا رُخ کیا' اور عصر کے وقت وہاں پہونچے۔ پہلے وہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن سویلم العرینی کے گھر اترے' اور پھر اپنے ایک شاگرد احمد بن سویلم کے ہاں منتقل ہو گئے۔ خبر پہنچتے ہی امیر درعیہ محمد بن سعود اپنے بھائیوں' مشاری اور ثنیان کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوا' اور سب نے مل کر شیخ کو امداد اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔[۱]

یہ مختصر روداد ابنِ غنام سے منقول ہے۔ ابنِ بشر نے اس اہم واقعہ کو جسے شیخ کی تبلیغی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے' ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ابنِ غنام کے بعد ہم ابنِ بشر کی روایت بھی ذیل میں درج کرتے ہیں:

---

۱ روضۃ الافکار: ۲/۶

"شیخ درعیہ عصر کے وقت پہونچے، جہاں وہ ایک خوش بخت انسان محمد بن سویلم العرینی کے گھر اترے۔ یہ بیچارہ عربی اخلاق سے مجبور ہو کر کچھ نہ بولا، پر امیر کے خوف سے اسکے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ شیخ نے نصیحت کی اور تسکین دی

سیجعل اللہ لنا و لك فرجاً و مخرجاً"

امیر محمد بن سعود کی معاونت | ابنِ سویلم کے گھر ٹھہرے، تو وہ دعوتِ توحید کا مرکز بن گیا۔ لوگ چھپ چھپ کر آنے لگے۔ اہلِ علم خاص طور پر مستفید ہوتے۔ لیکن یہ صورت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ شیخ نے امیر سے سلسلہ جنبانی کرنا چاہی اور امیر کے بھائیوں مشاری اور ثنیان سے گفتگو کی۔ انھوں نے پہلے امیر کی بیوی موضیٰ بنت ابی وحطان سے جو نہایت ذی فہم اور متدین خاتون تھی، شیخ کے علم و فضل کی تعریف کی اور اسے امیر سے سلسلۂ جنبانی پر آمادہ کیا۔ قدرت کو یونہی کرنا تھا۔ موضیٰ کے دل پر خود بخود شیخ کے علم و فضل کا سکہ جم گیا۔ اس نے امیر سے عرض کی :۔

"اللہ نے یہ نعمت تمھارے ہاں بھیج دی ہے، اٹھو اور اس کی مدد کرو۔ تمھاری دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔"

امیر محمد بن سعود، جو شیخ کی دعوت سے پہلے بھی حسنِ اخلاق میں مشہور تھا، اپنی بیوی کی گفتگو سے متأثر ہوا اور اس کے دل میں شیخ کی محبت گھر کر گئی۔ سب کے اصرار سے اس نے ملنے میں پہل کی اور اخلاق و عقیدت سے پذیرائی کی۔ شیخ نے جواب میں اپنی دعوت کے اہم حصوں (کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد) پر مختصر سی تقریر کی اور اہلِ نجد کی برائیوں سے آگاہ کیا اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔

امیر متاثر ہوا اور بے ساختہ بول اٹھا:۔

"اے شیخ! یہ تو بلا شبہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ میں آپ کی امداد واطاعت اور مخالفینِ توحید سے جہاد کے لئے تیار ہوں لیکن میری دو شرطیں ہیں:۔

۱۔ اگر ہم نے آپ کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی، تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں"۔

۲۔ اہلِ درعیہ سے فصل کے وقت میں کچھ مقررہ محصول لیتا ہوں آپ مجھے اس سے نہ روکیں"۔

شیخ نے جواب دیا:۔

"پہلی شرط بسر وچشم منظور ہے، ہاتھ لاؤ: الدم بالدم والھدم بالھدم (میرا خون تمہارا خون اور میری تباہی تمہاری تباہی)۔ رہی دوسری شرط سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔"

امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عہد کیا کتاب وسنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ یہ ۱۱۵۷ھ[1] یا ۱۱۵۸ھ۔

---

[1] ابن غنام ان سب واقعات کا مختصر ذکر کرتا ہے اور ۱۱۵۷ھ کے حدود میں: کانت ھذہ الامور فی حدود سنۃ سبع وخمسین بعد المائۃ والالف من الھجرۃ (۲: ۴)

ابن بشر نے انتقال درعیہ کی تاریخ ۱۱۵۸ھ لکھی ہے (صفحہ ۱۵) اور تفصیلات 'عنوان المجد' سے ماخوذ ہیں (۱: ۱۲ - ۱۱)۔

کا ذکر ہے۔ امیر کا بیعت کرنا تھا کہ جوق جوق لوگ استفادہ اور تجدید ایمان و اعمال کے لئے آنے لگے۔ عیینہ کے پرانے فیض یافتہ اور ہم نشین، جن کے دلوں میں شیخ کی دعوت گھر کر چکی تھی، درعیہ آگئے۔ ان آنے والوں میں خود عثمان بن معمر رئیسِ عیینہ کے بعض عزیز بھی تھے۔

ارادت مندوں کا پہلا گروہ یوں تو عیینہ ہی کے دورِ قیام میں شیخ کی طرف لوگ کھنچنے لگے تھے، لیکن ایک عرصہ تک بدعات اور تاریکی میں گھرے رہنے کے بعد عام طور پر خلقت قبولِ حق میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھی۔ درعیہ کے قیام اور امیر محمد بن سعود کی نیک نامی نے دعوت کی کامیابی کے لئے اچھی زمین تیار کردی۔ جن خوش قسمت لوگوں نے آغاز کار ہی میں جوش و خروش کے ساتھ دعوت پر لبیک کہا اور اس سلسلہ میں خود بھی ابتلاء و محن سے دوچار ہوئے، ان میں بعض نام ابن غنام کی عنایت سے ہم تک پہنچ گئے ہیں۔

خاندانی اور باوجاہت لوگوں میں محمد بن سعود کے تین بھائیوں مشاری[1]

---

[1] یوں تو اس دعوت، اور پھر آگے چل کر جہاد و قتال کے سلسلہ میں امیر محمد بن سعود اور ان کے پورے گھرانے نے نمایاں کام کئے، لیکن ہمیں یہاں بحث صرف شیخ کی دعوت سے ہے، اور اس سلسلہ میں ثنیان بن سعود (ف ۱۱۸۶ھ) اور مشاری بن سعود (ف ۱۱۸۹ھ) زیادہ ممتاز ہیں۔ مشاری نے بھائی کی بڑی امداد کی، اور ان کے بیٹے حسن بن مشاری نے لڑائیوں میں شمشیر آبدار کے خوب جوہر دکھائے۔ ثنیان بن سعود زاہد اور عفیف النفس تھے۔ گو وہ بینائی سے محروم تھے، لیکن ان کی بصیرت بڑھی ہوئی تھی۔ اصل میں محمد بن سعود انہی کے مشورہ سے شیخ کی امداد پر کمربستہ ہوئے۔

(روضۃ الافکار ۲: ۹۴-۱۰۵؛ عنوان المجد ۲: ۱۰-۹)۔

ثنیان اور فرحان کے نام پہلے آتے ہیں۔ اہل علم میں احمد بن سویلم اور عیسیٰ بن قاسم زیادہ ممتاز تھے، اور عام رسوخ واثر کے اعتبار سے محمد الخزیمی، عبداللہ بن دغیثر، سلیمان الوشبیقیری، حمد بن حسین کے نام آج تک زبان زد ہیں۔ فلبی (ص ۱۲-۱۳) کے بیان کے مطابق:

"یہ وہابیت کے پہلے بہادر کارکن تھے، ان کے نام آج تک عزت سے لئے جاتے ہیں، اور ان کی اولاد سلطان کے دربار میں اعزاز کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔"

ابن معمر کی زود پشیمانی

دعوت کی روز افزوں عمومیت اور مقبولیت کی خبر پا کر ابن معمر سے نہ رہا گیا۔ اسے اپنے پہلے طرز عمل پر بڑی پشیمانی ہوئی۔ اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کی۔ ساتھ ساتھ عیینہ واپس چلنے کی درخواست بھی کی۔ شیخ نے جواب میں صاف کہا:

"اب یہ امیر ابن سعود کے اختیار میں ہے، ان کی اجازت ہو تو میں تیار ہوں ورنہ انھیں چھوڑ کر اب کسی دوسرے کی رفاقت منظور نہیں۔"

یہ واضح جواب پاکر ابن معمر نے خود میزبان محمد بن سعود سے اجازت طلب کی، لیکن وہ اس نعمت کو اپنے گھر سے کسی دام پر الگ کرنے کو تیار نہ تھے۔

دورِ عمل

شیخ کی تشریف آوری سے پہلے درعیہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں جہالت کی گرم بازاری تھی۔ شیخ نے سب سے پہلے وعظ و درس کے حلقے قائم کئے اور خود صبح سے شام تک آنے والوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے۔ اور اپنی دعوت، دعوتِ توحید و اخلاص فی عبادۃ اللہ کی اہم اور ضروری چیزیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ شیخ کی جاذب شخصیت اور دعوت کی سچائی نے فوری اثر دکھایا، مجالسِ وعظ و تذکیر سے فائدہ

پہونچا کہ دلوں سے ما الفینا علیہ آباءنا کا زنگ دور ہونے لگا، اور رسم ورواج کے خرافات کو وہ صرف قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔

ان مجالس کی کشش دور دور سے تشنگانِ علم کو درعیہ لے آئی، جہاں رزق کی تنگی کے باعث یہ علم وعمل کے پیاسے راتوں کو کسی حرفت کے ذریعہ قوت لایموت حاصل کرنے کی کوشش کرتے، اور دن کا وقت اللہ کی کتاب اور اس کے برگزیدہ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بتائی ہوئی باتوں کے سننے کے لئے وقف رہتا۔ شاگردوں اور ارادت مندوں کی زیادتی اور ان کی میزبانی کے باعث شیخ برابر مقروض رہتے۔[1] بہر حال دعوت کی مقبولیت دن پر دن بڑھتی گئی، اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔

دعوت کی وسعت | اہلِ درعیہ تو شیخ کے قدم رکھتے ہی عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے لیکن وہ اس پر قانع نہ تھے، نجد کے مختلف حصّوں اور ان کے سرداروں کو ترغیب دیتے، اور اپنی دعوت سے آگاہ کرتے۔ گو مخالفتیں بھی ہوئیں، اور افترا پردازیوں میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ پھر بھی حق کی آواز بلند ہوتی گئی، اور آہستہ آہستہ اس کے ثمرات بھی ظاہر ہونے لگے۔ قیام درعیہ کے دوسرے ہی سال (۱۱۵۸ھ یا ۱۱۵۹ھ) امیر عُیینہ نے آکر بیعت کی، اور حدود شرعیہ کے نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہلِ حریملا نے بھی بیعت کی۔ ادھر امیر محمد بن سعود کی معاونت کا یہ عالم تھا، کہ خمس اور زکوٰۃ کی تمام رقمیں شیخ کے ہاتھ میں دی جاتیں، اور وہ انھیں بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ امیر ابن سعود اور اُن کے جانشین عبد العزیز بن محمد بن سعود (جو ۱۱۷۹ھ/۱۱۶۵ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد منصبِ امارت پر متمکن ہوئے) شیخ

---

[1] عنوان المجد ص ۱۲-۱۵۔

کی اجازت کے بغیر ادنیٰ تصرف روا نہیں رکھتے۔ با ایں ہمہ شیخ کی للّٰہیت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے پاس ایک حبہ بھی نہیں رکھتے، اور جو کچھ آتا، سب اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔

ابن بشر کا بیان ہے (ص۱۵) "کہ خمس اور زکوٰۃ سے جو کچھ آتا، وہ فوراً تقسیم کر دیتے۔ ان کی اس فراخ دستی کا نتیجہ یہ تھا، کہ وہ برابر مقروض رہتے، صرف فتح ریاض[1] (۱۱۸۷ھ ۱۷۷۳ء) کے وقت ان پر چالیس ہزار قرض تھا، جو مالِ غنیمت سے ادا کیا گیا۔"

یہ سارا قرض اور یہ تمام دریا دلی تبلیغ کے سلسلہ میں ہوتی تھی، جو فتح ریاض تک برابر جاری رہی۔ فتح ریاض کے بعد شیخ کو اپنی دعوت کی کامیابی کے متعلق ایک گونہ اطمینان ہو گیا، تو انھوں نے امیر عبد العزیز کو سیاہ و سپید کا مالک بنا کر اپنے آپ کو بیت المال کے انتظامات سے بالکل الگ کر لیا۔ اور اپنی تمام توجہ تعلیم و تدریس پر مرکوز کر دی، لیکن عبد العزیز شیخ کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتے، ہر کام میں ان کی رائے مقدم تھی۔

تبلیغ عام | اب تک شیخ کی دعوت نجد کے اضلاع تک محدود رہی، لیکن یہ دعوت عام تھی، اصلاح کی ضرورت صرف نجد میں نہ تھی، تمام اسلامی دنیا انحطاط کے عالم میں تھی۔ اصلاح کی ابتداء گھر سے ہوتی ہے، اس لئے قدرتی طور پر عُیینہ، حُریملا، درعیہ اور عارض کے دوسرے قصبے شیخ کی دعوت کے اوّلین مرکز بنے، لیکن جونہی ان علاقوں میں زندگی کی علامتیں ظاہر ہوئیں، شیخ نے اپنی دعوت کا حلقہ وسیع کیا، اور دور دور

---

[1] عنوان المجد: ص۱۵، ریاض پر مکمل قبضہ ربیع الآخر ۱۱۸۷ھ کے اواخر میں یا اُس کے بعد ہُوا۔ (جولائی ۱۷۷۳ء)۔

دور کے شہروں کے علماء، امراء، اور قضاۃ کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے، اور انہیں اپنی دعوت کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے لگے، پر کم تھے وہ جنھوں نے شروع شروع دعوت قبول کی، زیادہ وہ تھے، جنھوں نے شیخ کی دعوت کا مذاق اڑایا، کسی نے انھیں جاہل کہا، کسی نے جادوگر اور کسی نے ایسی تہمتیں لگائیں جن سے وہ پاک تھے۔

دعوت پر لبیک کہنے والوں، اور اس کی حمایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز صنعاء (یمن) کے مجتہد النظر عالم امیر محمد بن اسماعیلؒ[1] (ف ۱۱۸۲ھ) تھے، جنھوں نے شیخ کی دعوت پاکر اپنا مشہور وجد آفرین قصیدہ لکھا، جو اہلِ علم میں بہت مقبول ہوا، اس کا مطلع یہ ہے :-

سلامی علی نجد و من حل بالنجد — و ان کان تسلیمی علی البعد لا یجدی

اس قصیدہ میں شیخ کی مدح، بدعات کی برائی، اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی پرزور تردید اور بہت سی مفید باتیں ہیں۔

امیر محمد بن اسماعیل کو شیخ کی دعوت سے زیادہ خوشی اس لئے ہوئی، کہ وہ اس سے پہلے اپنے کو اس باب میں منفرد خیال کرتے تھے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :-

لقد سرّنی ما جاءنی من طریقه — وکنت اری هذی الطریقة لی وحدی

---

[1] امیر محمد بن اسماعیل یمنی صنعانی اپنے وقت کے امام اور مجتہدِ مطلق کا رتبہ رکھتے تھے۔ ولادت شب جمعہ، ۱۵ جمادی الآخرہ ۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۷ء کحلان میں ہوئی، وفات کی تاریخ سہ شنبہ، ۳ شعبان ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۹ء ہے۔ ان کے مختصر توحیدی رسالہ تطهیر الاعتقاد عن ادران الالحاد کا حوالہ آچکا ہے، آگے بھی ذکر آئے گا، تصنیفات کے لئے ملاحظہ ہو بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۵۶) دیگر حالات کے لئے البدر الطالع (۲: ۹-۱۳۳) اور عنوان المجد (۱: ۶-۵۳)۔

شیخ کو امیر یمنی کے قصیدے اور تائید سے بڑی تقویت ہوئی، بعض رسالوں میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[51]

شیخ کے بھائی سلیمان بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) جو اپنے باپ کی جگہ حریملا کے قاضی تھے، اوّل اوّل ان کے مخالف ہوئے۔ اور ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے، جو غلط بیانیوں سے پر تھے۔ ابن غنام کی زبان میں انھوں نے "حسداً وغیرۃً" مخالفت کی تھی، شیخ نے ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے لیکن آخر میں انھیں توفیق ہوئی اور اپنے بھائی کے پاس تائب ہو کر آئے۔[52]

"رجع الی اخیہ بالدرعیۃ تائباً سنۃ ۱۱۹۰ فاحسن الیہ الشیخ و اکرم مثواہ"۔

(۱۱۹۰ھ میں تائب ہو کر اپنے بھائی کے پاس درعیہ آئے، تو شیخ حسنِ سلوک سے پیش آئے، اور ان کی آؤ بھگت کی۔)

سلیمان بن عبد الوہاب کا رسالہ الصواعق الالٰہیۃ فی الرد علی الوہابیۃ کے نام سے چھپا ہوا ملتا ہے، مخالف اس رسالہ کا ذکر کرتے ہیں، لیکن سلیمان کی توبہ اور "رجوع" کا نام بھی زبان پر نہیں لاتے۔

سلیمان بن عبد الوہاب کی مخالفت ۱۱۶۷ھ میں بہت تیز ہو گئی تھی، اسی سال شیخ نے اطراف و اکناف سے مسلمانوں کو جمع کیا، اور ان کے سامنے اپنی دعوت پر واضح اور کھلی ہوئی تقریر کی۔

دعوت کی بنیاد اور اس کی موافقت و مخالفت کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔

---

[51] ابن غنام (۲ : ۴ : ۱ - ۸ - ۵۶)۔ [52] ایضاً (۲ : ۱۰۸)۔

یہاں صرف دعوت کی عمومیت دکھانا تھی۔ تشنگانِ علم تو درعیہ جوق جوق آتے ہی تھے، شیخ کے تبلیغی رسالے، مبلغین اور ہدایت نامے بھی اطراف واکناف میں پھیل رہے تھے۔

ابنِ دواس اور دوسرے مخالف درعیہ کی اقامت کے تیسرے ہی سال (۱۱۵۹ھ) وہام بن دواس حاکمِ ریاض کی زیادتیوں نے شیخ اور امیر محمد بن سعود کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ریاض اور منفوحہ کے موحدین کو صرف اتباعِ شیخ کے جرم میں اس نے گوناگوں زیادتیوں کا شکار بنایا۔ مجبوراً شیخ نے بھی اپنے پیروؤں کو مقابلہ اور مقاتلہ کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا، امیر محمد بن سعود، ان کے بھائیوں اور بیٹوں نے معاندین کی خوب خبر لی، اور جنگ و قتال کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔

صرف وہام بن دواس حاکمِ ریاض سے پچیس تیس سال چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۱۵۹ھ سے ۱۱۸۷ھ تک دونوں قوتیں برسرِ پیکار رہیں۔ آخر ۱۱۸۷ھ میں عبدالعزیز محمد بن سعود کے تازہ حملہ کی خبر پاکر ابن دواس شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلب نجد (ریاض) پر امیر عبدالعزیز کا مکمل قبضہ ہوگیا۔[۵]

اسی دوران میں آس پاس کی دوسری طاقتیں بھی حملہ آور ہوئیں۔ عثمان بن معمر حاکم عیینہ نے بار بار دھوکا دیا۔ اہلِ نجد اور شیخ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر مخالفوں نے اوچھے ہتھیار استعمال کرنا شروع کئے، سلیمان بن محمد بن سحیم نے شیخ پر بہتان باندھے۔ اور ان کی طرف قسم قسم کی برائیاں منسوب کیں، خلیج فارس، احساء اور دوسرے ملکوں کو اس نے رسالے لکھ کر بھیجے۔ شیخ نے ان میں سے ایک رسالہ کا

---

۵ Arabia از فلبی (ص ۲۵-۱۳)۔

مفصل جواب دیا ہے۔ افترا پردازیوں اور جواب کی نوعیت پر آگے گفتگو ہوگی۔ ایک طرف یہ نام نہاد علم وعمل کے اجارہ دار تھے، دوسری جانب چھوٹے چھوٹے علاقوں کے سردار اپنی اپنی خود مختاری کے بچاؤ کی خاطر ان افترا پردازوں کا ہاتھ بٹانے لگے[۱]۔

پر ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور مطوع درعیہ سے نکل کر نجد کے تمام علاقوں میں پھیل گئے، تا آنکہ کم از کم قلب جزیرہ میں محمد بن عبداللہ (مفدیٔ بابی و امی، صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہوگئیں۔

وفات | شیخ نے پچاس سال مسلسل دعوت وتبلیغ کے بعد شوال یا ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ (جون یا جولائی ۱۷۹۲ء) میں رحلت کی[۲]۔

دنیا ومافیہا سے بے نیاز عجیب ہستی تھی۔ کم لوگوں کو اپنی زندگی میں ایسی قبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔

شیخ کے شاگرد ابن غنام[۳] نے ایک پر درد مرثیہ لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے:

الی اللہ فی کشف الشدائد نفزع ولیس الیٰ غیر المہیمن مفزع

محمد حامد فقی[۴] نے قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) کا بھی ایک مرثیہ نقل

---

[۲] ابن غنام (۲: ۷۴)؛ ابن بشر (۱: ۹۵)۔ باقی اکثر مغربی اور مشرقی مورخوں نے تاریخ وفات میں غلطی کی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو: بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۳۰)، مارگولیوتھ (انس. اسلام: ۴، ۱۰۸۶)؛ لبیب بتنونی (الرحلۃ الحجازیۃ: ۸۷)۔

[۱] ابن غنام: ۱، ۲۷-۲۸؛ ۱۶۷-۱۴۲۔

[۳] روضۃ الافکار (ص ۱۵۱)۔

[۴] اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی جزیرۃ العرب ص ۸۰۔

کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

مصاب دھا قلبی فاذکی غلائلی　　　　واصمی بسھم الانتجاع مقاتلی

ایک بڑی خصوصیت | تاریخ اسلام میں بارہا ایسا ہوا ہے، کہ غیر معمولی شخصیتیں، مہدویت یا مسیحیت کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مفید ہونے کے بدلے دین اور اس کی وحدت کے لئے انتہائی مضر ثابت ہوئیں۔ ہم اسے شیخ الاسلام کی دعوت کی انتہائی کامیابی خیال کرتے ہیں، کہ ان کی تعلیمات اور ان کے پیروان اوہام سے بالکل الگ تھلگ اور خطرات سے بال بال بچے رہے۔ بعض اہل علم[۱] نے افترا پردازیاں کیں، پر ان کے ماننے والے اور جانشین اپنے عقیدوں میں اتنے صاف اور واضح تھے، کہ ان کی ایک نہ چلی اور نجد کے موحد پر کوششوں کے باوجود ان کی تصنیفات اور رسالوں سے کوئی ایسا الزام نہ تراشا جا سکا۔ ان کی کتابیں کھلی ہوئی اور دو دو چار کے انداز میں اپنے لکھنے والے کی جرأت اور صداقت کی شہادت دیتی ہیں۔ پوری کتاب التوحید پڑھ جاؤ، کوئی پیچیدگی، تصوف، توہم، دور از کار باتیں، منطقیانہ استدلال، یونانی کج بحثی، ان میں کسی چیز کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ ملے گا۔

دوسری خصوصیت | محمد بن عبدالوہاب ایک ٹھیٹھ عالم تھے۔ پر ان کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دعوت کے ثمرات دیکھے، دینی ثمرات بھی، اور دنیوی پھل پھول بھی۔ ان کی زندگی میں نجد کا پورا علاقہ مفتوح ہو چکا تھا، امیر نجد اور اس کے اہل خاندان قدموں پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ سارا جاہ و حشم شیخ کی جوتیوں کا صدقہ تھا۔ مجاہد اور عام قوم انہی کو جانتی تھی، اور انہی پر فریفتہ تھی۔ وہ چاہتے تو سلطنت

---

[۱] احمد زینی دحلان (ف سنہ ۱۳۰۴ھ) کی الدرر السنیہ (ص ۴۶) ملاحظہ ہو!

میں اپنی اولاد کا حصہ رکھتے، خود زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے۔ لیکن انھوں نے اپنے کو ان ذمہ داریوں سے یکسر الگ رکھا۔ امیر محمد بن سعود اور ان کے جانشین امیر عبد العزیز ان کے مشوروں کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور نہ کرنا چاہتے۔ سارا مال غنیمت ان کے قدموں پر لاکر ڈال دیا جاتا، لیکن اس اللہ کے بندے نے اپنے کام سے کام رکھا۔ جب تک ضرورت رہی دخل دیتے رہے، جونہی انھوں نے محسوس کیا کہ اب دعوت کی بنیادیں استوار ہو گئی ہیں، اپنے کو ملکی انتظامات اور مالِ غنیمت کے نظم و نسق سے یکسر الگ کر لیا۔ شیخ کی اس بے نفسی کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اُن کی اولاد بھی دنیاوی جاہ و حشم سے الگ دین کی خدمت میں مصروف رہی۔ اور آج تک جب کہ شیخ کی وفات کو ڈیڑھ سو برس ہو گئے، کبھی ان کی اولاد تخت و تاج کے لئے آلِ سعود سے دست بہ گریباں نہیں ہوئی۔

اولاد و احفاد شیخ کے شاگردوں اور ان کے حلقۂ درس و ارشاد سے مستفید ہونے والوں کا شمار و استقصا، تو تقریباً ناممکن ہے۔ جس درس میں پچاس ساٹھ سال مسلسل خوشہ چینوں کا تانتا بندھا رہا ہو، اس کی وسعت و ہمہ گیری کا کیا ٹھکانا؟ اگر شاگردوں کا ذکر کیا بھی جائے، تو تذکرے اور تراجم کی کیابی الگ دامن پکڑتی ہے۔ اس لئے ہم شیخ کے شاگردوں میں صرف ان کی اولاد و احفاد کا تذکرہ کریں گے، جو بجا طور پر اب آل الشیخ کے نام سے پکارے جاتے ہیں، اور یہی ان کا نسب ہے۔ یہ شیخ کی خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے اپنے ایسے جانشیں چھوڑے، جو بالکل انہی کے طریقہ کے مطابق سنت رسول کے متبع اور تبلیغ و تدریس میں مشغول رہے، اور اس سے زیادہ مسرت و اعجاب کی بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ آج تک منقطع نہیں ہوا۔ آج تک ان کی اولاد علم و عمل میں پورے نجد میں ممتاز ہے۔

شیخ کثیر العیال تھے، بعض لڑکے ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے، وفات کے وقت انھوں نے چار بیٹے چھوڑے، حسین[۱]، عبداللہ[۲]، علی[۳]، ابراہیم[۴]۔

ابن بشر کہتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کے درس میں طلبہ کا اتنا ہجوم دیکھا کہ اگر کسی سے بیان کیا جائے تو شاید اُسے یقین نہ آئے۔

"ان میں سے ہر ایک کے گھر کے پاس ایک مدرسہ تھا، جس میں پردیسی طالب علم رہا کرتے، اور ان کے مصارف بیت المال سے ادا ہوتے، یہ لوگ شب و روز تحصیلِ علم میں مصروف رہتے۔"[۱]

ان میں حسین بڑے تھے، اور شیخ کے بعد اصلی جانشین وہی سمجھے جاتے۔ درعیہ کے قضاء پر مامور تھے۔ درعیہ کی جامع مسجد کی امامت بھی ان کے سپرد تھی۔ سنہ ۱۲۲۴ھ میں وفات پائی[۲]۔ ان کے متعدد بیٹے تھے، اور سب کے سب علم و عمل میں ممتاز۔ ابن بشر نے علی، حمد، حسن، عبدالرحمٰن، عبدالملک کے نام گنائے ہیں۔ ان میں علی بڑے اور علم میں بھی ممتاز تھے۔ اس لئے اپنے اعمام کی موجودگی میں منصب قضاء پر مامور ہوئے۔ سعود بن عبدالعزیز (سنہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء، سنہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) عبداللہ بن سعود (مصلوب سنہ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء) ترکی (مقتول سنہ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (ف سنہ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) مختلف امیروں کے عہد میں عہدۂ قضاء پر مامور رہے۔ حمد زمانہ طالب علمی ہی میں وفات پا گئے۔ حسن، ترکی بن عبداللہ کے زمانہ میں ریاض کے قاضی تھے۔ فقہ میں اچھی دستگاہ تھی۔ عمر کم پائی۔ اور سنہ ۱۲۴۵ھ میں دار آخرت کو چل بسے۔ عبدالرحمٰن، ترکی اور فیصل دونوں کے دورِ حکومت میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ فقہ۔ تفسیر اور نحو کے اچھے عالم تھے۔ عبدالملک بن حسین بھی فیصل

---

۱ عنوان المجد (۱، ۹۳)۔ ۲ ایضاً (۱، ۱۴۳)۔

کے عہد میں حوطہ کے قاضی تھے۔ عبدالرحمٰن بن حسین، حسن بن حسین، عبدالملک بن حسین، سب کے سب شیخ عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد بن عبدالوہاب سے مستفید ہوئے (جن کا ذکر آگے آتا ہے) اسی طرح حسین بن شیخ الاسلام کی اولاد میں حسین بن حمد بن حسین بن شیخ الاسلام (قاضی حریق بہ عہد فیصل) حسین بن علی بن شیخ الاسلام (قاضی ریاض بہ عہد فیصل) اور عبداللہ بن حسن بن حسین بن شیخ الاسلام بھی شیخ عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام سے مستفید ہوئے۔

شیخ کے دوسرے بیٹے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب بھی بڑے عالم تھے۔ ان کا شمار علمائے مصنّفین میں تھا۔ حسین بن محمد کی وفات کے بعد یہی شیخ الاسلام کے جانشین مانے جاتے تھے۔ خود حسین بن محمد کی زندگی میں اُن کی علمی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں امیر سعود بن عبدالعزیز کے داخلہ مکّہ مکرّمہ کے وقت یہ ساتھ تھے۔ اور امیر سعود نے اپنی جماعت کے عقائد سے متعلق جو رسالہ تقسیم کرایا تھا، وہ انہی عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ ۱۲۳۳ھ میں ابراہیم پاشا کے حملہ درعیہ کے وقت موجود تھے، لیکن مصری فوجوں کی وحشت اور غارت گری، آپ سے دیکھی نہ گئی اور تلوار لے کر میدان میں کود پڑے:

"فشهر سيفه عبد الله ابن الشيخ محمد بن عبد الوهاب وانتدب واجتمعوا عليه[1] الخ"

اور خوب دادِ شجاعت دی۔ غالباً گرفتار کر کے مصر بھیج دیئے گئے اور وہیں وفات پائی[2]

---

[1] عنوان المجید (۱، ۲۰۶)۔ [2] ابن بشر شیخ عبداللہ بن محمد کی بہادری اور قتال کا ذکر کرتا ہے لیکن شہادت کے بارے میں خاموش ہے۔ دحلان (صد ۲۲۹) سلیمان بن عبداللہ بن محمد عبدالوہاب کے

ان کے دو بیٹے سلیمان بن عبداللہ اور علی بن عبداللہ سقوطِ درعیہ کے وقت قتل کئے گئے۔ سلیمان ممتاز عالم تھے، اپنے والد کی موجودگی میں درعیہ کے قاضی رہے۔ نیز امیر سعود کے دور امارت میں کچھ دنوں مکہ مکرمہ میں بھی انہوں نے قضا کے فرائض انجام دئے۔ امیر سعود بن عبدالعزیز کی مجلس میں صحیح بخاری کا درس اُن کے سپرد تھا، جو بہت بڑا علمی امتیاز تھا۔ خود عبداللہ بن شیخ الاسلام امیر سعود کی مجلس میں تفسیر طبری اور ابنِ کثیر کا درس دیتے تھے۔ ابن بشر خود ان مجلسوں میں شریک رہا ہے، اس کے بیان سے ان علمی مجلسوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔[۵۱] اُس نے ان کے طریقۂ تعلیم و تحدیث کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بہت ممتاز تھے، اسی لئے دحلان[۵۲] نے انھیں ان کے والد سے "زیادہ متعصب" بتایا ہے، کتاب التوحید کی ایک شرح بھی لکھی تھی، جو ابنِ بشر کے بیان کے مطابق نامکمل رہی۔[۵۳] اپنے والد

(بقیہ حاشیہ ص۴۴) قتل کا ذکر کرتا ہے، لیکن عبداللہ کے بارے میں خاموش ہے۔

ابن بشر کا ایک دوسرا بیان عبداللہ بن شیخ الاسلام کے قتل کی تردید کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"عبداللہ مذکور کے ایک بیٹے عبدالرحمٰن تھے، جو انہی کے ساتھ کم سنی ہی میں مصر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ازہر کے رواق حنابلہ میں مقیم ہیں، اور اُن کے پاس طلبہ آتے جاتے ہیں، اور ان میں علمی ذوق ہے،" (جلد ۱ ص ۹۳)

[۵۱] عنوان المجید: ۱، ۲۰۹، ۱۷۶، ۱۷۰، ۲۱۰۔

[۵۲] خلاصۃ الکلام صفحہ ۲۲۹۔

[۵۳] شیخ عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام نے یہ شرح مکمل کی، جیسا کہ انھوں نے فتح المجید کے دیباچہ میں تصریح کی ہے۔

شیخ احمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور شیخ حسین بن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) سے تحصیل کی تھی۔ ۱۲۳۳ھ کے اواخر میں قتل کئے گئے۔ اُن کے قتل کا واقعہ بھی عجیب دردناک ہے، آگے تفصیل آئے گی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک دوسری تالیف (کتاب التوضیح عن توحید الخلاق فی جواب اہل العراق) مطبوعہ ۱۳۱۹ھ ہمارے پیش نظر ہے جو اُن کی وسعتِ علم کی شاہد ہے۔ بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۳۲) نے ان کی دو کتابیں اور ذکر کی ہیں (ا) اوثق عری الایمان (ب) مسائل، جو راقم کی نظر سے نہیں گذریں۔ مجموعۃ التوحید المکیۃ (مطبوعہ ۱۲۴۳ھ) میں بھی شیخ سلیمان بن عبد اللہ کا ایک رسالہ بعض اہم مسائل کے جواب میں شامل ہے۔ ممکن ہے بروکلمن کا درج کردہ رسالہ مسائل اور یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ علی بن عبد اللہ بن الشیخ ۱۲۳۴ھ میں درعیہ کے قریب شہید ہوئے۔ حدیث وتفسیر میں اچھی دستگاہ تھی۔ انہوں نے بھی کتاب التوحید کی ایک شرح لکھی تھی[1]۔ عبد اللہ بن شیخ الاسلام کے تیسرے بیٹے عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بھی مشہور عالم ہوئے۔ حسین بن شیخ الاسلام کے متعدد مختصر رسالے اور فتوے مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ کے ایک مجموعے میں درج ہیں[2]۔

علی بن شیخ الاسلام بھی ممتاز عالم اور زہد وورع میں ضرب المثل تھے۔ فقہ وتفسیر میں اچھی دستگاہ تھی۔ قضا کا منصب پیش کیا گیا، لیکن انھوں نے غایت زہد وورع کی بناء پر قبول نہ کیا۔ اِن کے لڑکے کمسنی ہی میں انتقال کر گئے، صرف محمد بن علی بن شیخ الاسلام پھلے پھولے اور ممتاز عالم ہوئے۔

---

[1] عنوان المجد: ۱، ۹۳، ۲۱۵۔

[2] ملاحظہ ہو: کچی فہرست Hand-list نمبر ۲۶۲۵۔

چوتھے بیٹے ابراہیم مشہور صاحبِ درس ہوئے، ابن بشر نے اُن سے کم سنی میں (۱۲۲۴ھ) کتاب التوحید پڑھی تھی، قضا سے الگ رہے۔[51]

شیخ کے ممتاز شاگردوں میں اُن کے پوتے عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام بھی نجد کے چند ممتاز عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اُن کے والد شیخ کی زندگی ہی میں انتقال کر چکے تھے۔ کم سنی میں اپنے دادا سے کسبِ علم کیا، اور شیخ کے ممتاز شاگردوں احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور عبدالعزیز بن عبداللہ الحصین الناصری (م ۱۲۳۷ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ شیخ عبدالرحمٰن بن حسن کی حیثیت اپنے خاندان میں علمی مجدّد کی ہے۔ اُن کا علمی مرتبہ شروع سے مسلّم تھا۔ امیر سعود بن عبدالعزیز (ف ۱۲۲۹ھ) اور امیر عبداللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ) کے عہد میں درعیہ کے قاضی رہے۔ شیخ حسین بن شیخ الاسلام کی وفات (۱۲۲۵ھ) کے بعد اس خاندان کے اُن چار[52] افراد میں یہ بھی تھے جن کی علمی حیثیت مسلم تھی اور پایہ تخت (درعیہ) کے قضا کا کام جن کے سپرد تھا۔

سقوطِ درعیہ کے وقت (۱۲۳۳ھ) مصر چلے گئے تھے، بلکہ جلا وطن کر دئے گئے تھے، جب حالات استوار ہوئے، تو ۱۲۴۱ھ میں نجد واپس آئے، جہاں اُن کی ذات سے پھر ایک بار علم کی گرم بازاری ہوئی اور سینکڑوں اشخاص اُن کے درس میں شریک ہو کر کامیاب نکلے۔ خود شیخ الاسلام کے خاندان کے بیسیوں افراد اُن سے مستفیض

---

۵۱ عنوان (۱)، ۹۳۔

۵۲ اساطین اربعہ، جن کا ذکر اوپر آیا، اس ترتیب سے عزّت و قدر کے مستحق سمجھے جاتے تھے:

عبداللہ بن الشیخ، علی بن حسین بن الشیخ، عبدالرحمٰن بن حسن بن الشیخ، سلیمان بن عبداللہ بن الشیخ،

ہوئے۔[۱] ترکی بن عبداللہ (مقتول ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (ف۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) کے عہد میں قاضی القضاۃ اور خواص و عوام کا مرجع بنے رہے۔ ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود (مقتول ۱۲۴۹ھ) کی خاص مجلسوں میں درس کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ عام طور پر تفسیر ابن جریر کا درس ہوتا۔ فیصل بن ترکی کے عہد میں بھی درس و ارشاد کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ سقوط درعیہ سے پہلے اساطینِ اربعہ کی دھوم تھی۔ حالات استوار ہونے کے بعد امیر ترکی بن عبداللہ کے عہد میں صرف عبدالرحمٰن بن حسن بن الشیخ، اور علی بن حسین الشیخ رہ گئے۔ ترکی اور فیصل دونوں کے ایام حکومت میں، عبدالرحمٰن بن حسن اور علی بن حسین کے ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن بن حسین بن الشیخ اور عبدالملک بن حسین کے نام بھی بار بار آتے ہیں۔[۲] لیکن فیصل بن ترکی کے آخر دور میں (۱۲۵۶ھ کے بعد) صرف عبدالرحمٰن بن حسن بن الشیخ کا نام خاص طور پر آتا ہے؛ اور پھر فیصل کے بالکل آخری دور میں ان کے صاحبزادے عبداللطیف ابن عبدالرحمٰن قضا اور تدریس پر فائز نظر آتے ہیں۔ علی بن حسین بن الشیخ نے کافی عمر پائی، اور غالباً فیصل کے وسط عہدِ حکومت (تقریباً ۱۲۶۰ھ) میں رحلت کی۔ بہر حال فیصل بن ترکی کے آخری زمانہ حکومت میں یہ سب سے زیادہ محترم اور مخدوم تھے۔ بڑی عمر پائی، ابن بشر نے اپنی کتاب ۱۲۷۰ھ میں لکھی۔ اور ۱۲۶۷ھ کے حوادث پر ختم کی ہے۔ اس وقت یہ زندہ تھے۔ پالگریو نے اپنی سیاحت کے دوران میں (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) ریاض میں ان سے اور ان کے صاحبزادے عبداللطیف سے

---

[۱] عنوان: ۲، ۲۲۔ ۲۰، ۶۵۔

[۲] عنوان: ۲، ۷۳، ۶۵، ۸۸۔

ملاقات کی تھی[1] لیکن اسے غلط فہمی یہ ہوئی کہ وہ انھیں عبداللہ ابن الشیخ کا فرزند سمجھا۔ ۱۲۸۵ھ میں بڑی عمر پاکر وفات پائی۔

ابن بشر نے ان کی متعدد تالیفات اور رسالوں کا ذکر کیا ہے، سلیمان بن عبداللہ بن الشیخ (مقتول ۱۲۳۳ھ) کی غیر مکمل شرح کتاب التوحید کی تکمیل بھی ان کے قلم سے ہوئی تھی، جو "فتح المجید فی شرح کتاب التوحید" کے نام سے بار بار چھپ چکی ہے[2]۔

فتح المجید کے علاوہ ان کی دوسری کتاب (قرۃ عین الموحدین فی تحقیق دعوۃ الانبیاء والمرسلین) بھی چھپ گئی ہے۔ یہ اصل میں کتاب التوحید ہی کے حواشی ہیں۔ محمد حامد الفقی (جنھوں نے فتح المجید کا تازہ اڈیشن شائع کیا ہے) نے فتح المجید کے حواشی میں قرۃ عین الموحدین کے اقتباسات بہ کثرت دئے ہیں۔ ان کا ایک مختصر رسالہ عنوان المجد میں منقول ہے[3]، ابن بشر نے ان کے متعدد خطوط کے اقتباسات بھی دئے ہیں۔ مجموعۃ التوحید المکیۃ (۱۳۴۳ھ) میں بھی ان کے حسب ذیل تین رسالے شامل ہیں:۔

(۱) رسالۃٌ فی جواب الجہمیۃ (صفحہ ۳۶-۳۲)۔

(۲) رسالۃٌ فی حکم موالاۃ اہل الاشراک (صفحہ ۱۶۹ - ۱۵۷)۔

(۳) بیان المحجۃ فی الرد علی صاحب اللجۃ (صفحہ ۲۵۲ - ۲۰۵)۔

ان کے صاحبزادوں میں محمد بن عبدالرحمٰن بن حسن سقوطِ درعیہ کے وقت اپنے

---

[1] Narrative of a year's journey through central and Eastern Arabia جلد ۱ ص ۳۷۹ ۔

[2] ہمارے پیشِ نظر اس کا تازہ اڈیشن ہے، جو نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ مصر میں چھپا ہے۔

[3] عنوان: ۲، ۲۳-۲۶۔

اپنے دوسرے اہلِ خاندان کی طرح قتل کئے گئے۔[51]

عبداللطیف بن عبدالرحمٰن ان کے جانشین ہوئے۔ یہ صغر سنی ہی میں سقوطِ درعیہ کے وقت مصر چلے گئے تھے۔ اپنے والد اور دوسرے اہلِ علم سے تحصیل کی۔ سنہ ۱۲۶۴ھ میں نجد واپس آئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا بڑا ذخیرہ لائے۔ آتے ہی اپنے والد کے دست راست بن گئے اور علمی و تبلیغی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ سنہ ۱۲۶۲ھ تک فیصل بن ترکی (ت سنہ ۱۲۸۲ھ) کی مجلسوں میں عبدالرحمٰن بن حسن مدرس اور واعظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ سنہ ۱۲۶۵ھ میں عبداللطیف بن عبدالرحمٰن قاضی، امام، مدرس اہم حیثیت سے آگے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ابن بشر ان کے درسِ تفسیر کا بہت مداح ہے۔[52] پالگریو نے سنہ ۱۸۶۲ء / ۱۲۷۹ھ میں ان سے ملاقات کی تھی۔ اُس وقت ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی، پایۂ تخت ریاض کے قاضی تھے۔[53] ان کی کتاب "منہاج التقدیس والتاسیس فی الرد علی ابطال داؤد بن سلیمان بن جرجیس کا ذکر آگے آئے گا، ان کا ایک مختصر رسالہ مجموعۃ الھدیۃ السنیۃ۔ (ص ۲۸–۴۰) کے ضمن میں بھی طبع ہو چکا ہے۔ اس میں شیخ الاسلام کی مختصر سیرت بیان کی گئی ہے۔ سال وفات تحقیق کے ساتھ معلوم نہ ہو سکا۔ ایک نجدی عالم[54] اور سیاح کے بیان کے مطابق انھوں نے سنہ ۱۳۰۴ھ میں رحلت کی۔

شیخ عبدالرحمٰن بن حسن کے ایک دوسرے صاحبزادے اسحٰق بن عبدالرحمٰن بن حسن کا ذکر اب تک کسی تذکرہ میں نہیں ملا۔ لیکن ہمیں ان سے واقفیت عجیب دلچسپ

---

[51] عنوان: ۱، ۲۰۸۔
[52] عنوان: ۱، ۱۱۲، ۲۲۱
[53] پالگریو: ۱، ۲۷۹،
[54] شیخ عمران بن محمد بن عمران، ساکن ریاض (نجد)۔

طریقہ پر ہوئی۔ شوال (۵۹ھ) میں وطن جانا ہوا (اوگانواں ضلع پٹنہ)، اور اپنے خاندانی کتاب خانہ کی خستہ حال کتابوں کا جائزہ لینے لگا، تو صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان کا ایک نسخہ ملا، جس کے پہلے ورق پر یہ عبارت خالص عربی خط میں لکھی ملی "فی ملک الحقیر الفقیر اسحٰق بن عبد الرحمٰن بن حسن بن محمد النجدی الحنبلی عفی اللہ عنہم"

میری خوشی کا کیا کہنا! الٹتے پلٹتے پر آخر میں اسی خط میں ایک لمبا نوٹ ملا، جس سے ان کے علم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ درمیان میں بھی ایک مختصر سا نوٹ ہے۔ شروع میں نام کے نیچے مہر بھی ہے۔ صرف اسحاق کا لفظ صاف طور پر پڑھا جاتا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب ہمارے ہاں کس طرح پہونچی؟ قرین قیاس یہ ہے کہ عاجز کے نانا مولانا عبد الصمد (ف ۱۳۱۸ھ) سے ان کے تعلقات ہوں گے۔ مولانا عبد الصمد ایک جید اہلِ حدیث عالم تھے، اور وقت کے مشہور اہلِ حدیث عالموں سے ان کے تعلقات دوستانہ اور برابری کے تھے تفتیش سے پتہ چلا کہ یہ اسحاق بن عبد الرحمٰن بن حسن ہندوستان رہے تھے اور مولانا سید نذیر حسین صاحب سورج گڈھی مونگیری دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ) نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) اور مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانی (ف ۱۳۲۶ھ) سے استفادہ بھی کیا تھا ۱۳۳۰ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

موجودہ عہد میں اس خاندان کے عالموں میں محمد بن عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن سب سے زیادہ ممتاز ہیں ان کا ایک رسالہ (مؤلفہ ۱۳۳۹ھ) الدرر السنیۃ کے مجموعے میں شامل ہے۔ ان کی عمر اس وقت اسی کے قریب ہوگی (روایت شیخ عمران بن محیم)

محمد حامد الفقی نے فتح المجید کے دیباچے میں اس خاندان کے دو معاصر عالموں عبداللہ بن حسن[1] آل الشیخ (رئیس قضاۃ، مملکۃ سعودیہ) اور محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف کے نام لئے ہیں؛

---

[1] عبداللہ بن حسن بن حسین بن علی بن محمد بن عبدالوہاب (روایت شیخ عمران)۔

دوسرا باب

(۲)

سیاسی برتری

شیخ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد نجد اور اطراف نجد میں جو خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں، وہ سب ثمرہ تھیں شیخ الاسلام کی دعوت، اور ان کے اخلاص کا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ نے اہل نجد کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک غیر معمولی انقلاب، نہیں، بلکہ کایا پلٹ کر دی۔ خوش قسمتی سے انھیں محمد بن سعود (ف ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء - ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) اور سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرماں روا ملے، جنھوں نے شیخ کے مشن کی تکمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

شیخ کی دعوت کے ساتھ ساتھ آل سعود کا نام بھی وابستہ ہو گیا ہے، اس لئے ہم مختصر طور پر آل سعود کی تاریخ کے ان اہم حصوں کو پیش کر دینا چاہتے ہیں، جن کا اس تحریک سے خاص اور بلا واسطہ تعلق ہے۔[1]

محمد بن سعود امیر محمد بن سعود (ف ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) نے دعوت کے پھوٹتے پھلتے ہی حرمین کو ایک وفد بھیجا جس نے شریف مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء - ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) سے حج کی عام

---

[1] نجد کی سیاسی تاریخ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ ہم صرف ان گوشوں کو اُجاگر کر رہے ہیں

اجازت طلب کی اور علمائے حرمین سے مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کی۔ "مفتیان حرم" کا رویہ افسوس ناک رہا اور وفد کے اراکین گرفتار کر لئے گئے، بعضوں نے مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔

امتناعِ حج | یہ دحلان کا بیان ہے[۱] جس کی دونوں کتابوں (خلاصۃ الکلام فی امراد البلد الحرام، اور الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ) میں نہ تاریخیں صحیح درج ہیں، نہ واقعات کی تدوین میں دیانت داری سے کام لیا گیا ہے۔ دحلان نے سال کی تعیین بھی نہیں کی۔ بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اہل نجد کے خلاف امتناع حج کے احکام صادر ہو چکے تھے۔ ابن بشر ۱۱۶۲ھ کے تحت میں صرف اس قدر ذکر کرتا ہے[۲]:-

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳) جن کا شیخ کی سرگرمیوں سے خاص تعلق تھا۔ نجد اور آل سعود کی تفصیلی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو

(۱) عنوان المجد (ابن بشر)۔

(۲) عجائب الآثار (جبرتی) جلد ۳ و ۴،

(۳) تاریخ نجد (آلوسی) صفحہ ۱۰۴-۹۰،

(۴) حاضر العالم الاسلامی، جلد ۴ صفحہ ۱۷۲-۱۶۱ (امیر شکیب ارسلان)

(۵) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (مقالہ: ابن سعود)۔

(۶) Arabia (از فلبی) جو بہت مفصل اور کافی سے زیادہ ہے۔

امین ریحانی کی کتابیں بھی عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں مشہور اور مقبول ہیں، مآخذ کے سلسلے میں ان کے علاوہ اور دوسری کتابوں کا ذکر آئے گا۔

[۱] الدرر السنیۃ: ص ۴۴۔

[۲] عنوان المجد: ۱، ۲۳۔

"۱۱۶۲ھ میں مسعود بن سعید شریف مکہ نے نجدی حاجیوں کو قید کر لیا اور ان میں سے کچھ مر گئے۔"

شیخ الاسلام کی دعوت کا ظہور ۱۱۵۷ھ کے بعد ہوا، اور شہرت و مقبولیت ۱۱۶۰ھ کے بعد شروع ہوئی۔ اس لئے یہ قرین قیاس نہیں کہ ۱۱۶۲ھ سے پہلے نجد کے حجاج بیت الحرام کی زیارت سے روکے گئے ہوں۔ یہ قرائن بتلاتے ہیں کہ حاجیوں کی گرفتاری کے اسی واقعہ سے امتناع حج کا آغاز ہوا اور درمیانی وقفوں کے ساتھ یہ پابندی اہل نجد پر برابر عائد رہی۔ ۱۱۸۳ھ، ۱۱۸۵ھ، ۱۱۹۷ھ میں خاص طور پر اجازت ملی اور نجد کے عالم و عامی بڑی تعداد میں زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ لیکن یہ "اجازتیں" اتفاقی تھیں۔ سعود بن عبد العزیز کے داخلۂ حرم[۱] سے پہلے اہل نجد کو کبھی بلا روک ٹوک حج و زیارت کا موقع نہ ملا۔ تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:۔

(الف) امیر محمد بن سعود کی وفات عین دعوت کے شباب میں | عبد[۲] العزیز بن محمد بن سعود

۱؎ سعود بن عبد العزیز بن محمد بن سعود کو ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ کی زیارت نصیب ہوئی۔

۲؎ بعض لکھنے والے عبد العزیز بن محمد بن سعود کو شیخ الاسلام کا نواسہ بتاتے ہیں (فلبی: ص ۴۲-۱۴۱، ڈکشنری آف اسلام: ص ۶۶)؛ لیکن یہ صحیح نہیں۔ عام طور پر مؤرخ لکھتے ہیں کہ امیر محمد بن سعود سے شیخ کی ایک صاحبزادی منسوب تھیں۔ لیکن شیخ الاسلام کی درعیہ میں اقامت ۱۱۵۷ھ میں ہوئی ہے اور یہ شادی اس کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔ دوسری طرف ہمیں موثق ذرائع سے یہ معلوم ہے کہ امیر عبد العزیز ۱۱۶۰ھ میں سن شعور کو پہنچ چکے تھے اور شوکانی (البدر الطالع: ۱/۲۶۳) کے بیان کے مطابق سعود بن عبد العزیز کی ولادت ۱۱۶۰ھ یا ۱۱۶۳ھ میں ہو چکی تھی۔ اس لئے

ہوئی۔ عبد العزیز[۵] بن محمد بن سعود جانشین ہوُا۔ مار گولیوتھ کے بیان کے مطابق ۱۱۷۹ھ/۱۷٦٦ء میں ایک وفد مکہ گیا، جہاں اُن کی خاطر مدارات ہوئی۔ شریف نے میزبانی کی اور وفد نے علماء کو یقین دلایا کہ ان کے عقائد (امام اہل سنت) احمد بن محمد بن حنبل سے الگ نہیں۔"

یہ مار گولیوتھ کا بیان ہے، ابن غنام، ابن بشر اور فلبی ۱۱۷۹ھ میں کسی وفد کا ذکر نہیں کرتے۔ پتہ نہیں، اس کا ماخذ کیا ہے۔ ابن غنام اور ابن بشر کے سکوت کے بعد مار گولیوتھ کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ احمد زینی دحلان (الدرر السنیہ ص۴۴) کے بیانات بھی اس سلسلہ میں حد درجہ متعارض اور نا قابل وثوق ہیں۔

۱۱۸۳ھ/۱۷٦۹ء تا ۱۱۹۷ھ کے بعد پہلا حج ۱۱۸۳ھ/۱۷٦۹ء میں اشراف حجاز کے ایک دستہ سے کہیں موحدین کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ شریف منصور دستہ کا سردار گرفتار ہوُا۔ امیر عبد العزیز نے اسے بلا فدیہ کے رہا کر دیا، جس کا اچھا اثر پڑا اور معاوضے میں شریف[٦] مکہ نے حج کی اجازت

(بقیہ حاشیہ ص۵۵) شیخ الاسلام اور امیر ابن سعود کے رشتہ مصاہرت کو مان بھی لیا جائے (ابن غنام اور ابن بشر دونوں میں سے کسی نے اس رشتہ کا ذکر نہیں کیا ہے) تو عبد العزیز بن محمد بن سعود شیخ کے نواسے نہیں ہو سکتے۔ اس کے بالکل برعکس Brydges لکھتا ہے کہ خود عبد الوہاب (؟ ابن عبد الوہاب) نے محمد بن سعود کی لڑکی سے شادی کی تھی (ص۱۰) نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ عبد العزیز بن محمد بن سعود نے عبد الوہاب (؟ ابن) کی لڑکی سے شادی کی جن کی بطن سے سعود بن عبد العزیز پیدا ہوا۔ پتہ نہیں صحیح کیا ہے؟

[۵] ۱۱۷۹ھ/۱۷٦۵ء۔

[٦] انگریز اور یورپی مورخ مکہ کے حاکم کو Grand Sherif اور خاندان کے دوسرے افراد کو صرف 'شریف' کہتے ہیں۔ عربی میں یوں تو "شریف" کا لفظ عام حسنی سادات کے لئے بھی

دی اور موحدین کی ایک کافی تعداد نے اس سے فائدہ اٹھایا:۔

"...... فاغتنم لذٰلك من المسلمين طائفة وسارت للحج آمنة"[۵۱]

یہ اجازت بہرحال اسی سال تک محدود رہی، البتہ اس سے آئندہ گفت وشنید اور بحث وتمحیص کا دروازہ کھل گیا۔

پہلا نجدی وفد: ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء | ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں شیخ اور عبدالعزیز نے احمد بن سعید

(بقیہ حاشیہ ۵۶) مستعمل ہوتا ہے، مگر شریف مکہ کا لفظ مکہ کے حاکم ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اشراف کی تاریخ کے لئے دحلان کی کتاب خلاصة الكلام فی امراء البلد الحرام ملاحظہ کی جاسکتی ہے، گو زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔

محمد لبیب البتنونی کی الرحلة الحجازیة (ص ۷۳-۸۱) میں بھی اشرافِ مکہ کی مختصر تاریخ دی گئی ہے Bruckhart کی Travels in Arabia (۱: ۴۰۵-۴۴۴) میں بھی "مکہ کی حکومت" پر ایک پر از معلومات باب ہے، ہوگارتھ کی A History of Arabia میں بھی "اشراف مکہ" پر ایک باب ہے، مگر مختصر۔ ہماری تحریک کا تعلق جن اشراف سے رہا، ان کے نام اور سنین تولیت یہ ہیں:

(۱) مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ) (۲) مساعد بن سعید (۱۱۶۵ھ) (۳) جعفر بن سعید (۱۱۷۲ھ) (۴) مساعد بن سعید (۱۱۷۳ھ) (۵) عبداللہ بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۶) احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۷) عبداللہ بن حسن (۱۱۸۴ھ) (۸) احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۹) سرور بن مساعد (۱۱۸۶ھ) (۱۰) عبدالمعین بن مساعد (۱۲۰۲ھ) (۱۱) غالب بن مساعد (۱۲۰۲ھ) (۱۲) یحییٰ بن سرور (۱۲۲۸ھ) الخ۔

۵۱ روضة الافکار: ۲: ۹۱۔

(۱۱۸۴ھ - ۱۱۸۶ھ) والیٔ مکہ کو ہدیے بھیجے۔ اس نے خط و کتابت کے ذریعہ ان (شیخ اور امیر عبدالعزیز) سے ایک عالم و فقیہ کے بھیجنے کی فرمائش کی تھی، جس سے علماء مکہ ان کی دعوت اور مسلک پر گفتگو کر سکیں۔ تو شیخ اور عبدالعزیز نے شیخ عبدالعزیز بن الحصین کو ایک خط دے کر بھیجا جس کا مضمون یہ تھا......

جن علماء (مکہ) نے ان سے گفتگو کی، ان کے نام یہ ہیں: یحییٰ بن صالح الحنفی، عبدالوہاب بن حسن الترکی (سلطان کے مقرر کردہ مفتی) اور عبدالغنی بن ہلال۔ تین مسئلوں (تکفیر[1]، ہدمِ قباب[2]، بزرگوں[3] سے مرادیں مانگنا) پر وہ شیخ عبدالعزیز کی دلیلوں سے مطمئن ہو گئے اور شیخ عبدالعزیز اعزاز و توقیر کے ساتھ واپس کئے گئے۔[1]

ابن بشر[2] نے اس وفد کا صرف سرسری تذکرہ کیا ہے، قلبی[3] نے اس وفد کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کا ماخذ غالباً ابنِ غنام کی روضۃ الافکار رہی ہے، لیکن اس نے ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء کے حج اور ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء کے وفد کو خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ ابن غنام نے دونوں واقعے الگ الگ ذکر کئے ہیں۔

---

[1] روضۃ الافکار: ۲: ۹۲-۹۱؛ محمد حامد فقی (ص ۳۶) نے یہ بھی لکھا ہے کہ:-

"شیخ عبدالعزیز بن حصین کا اثر دیکھ کر شریف احمد بن سعید کے اقارب اس سے بگڑ گئے، اور سبھوں نے مل کر اسے امارت سے الگ کر دیا۔ غالباً علماء سوء کا اس میں ہاتھ رہا ہوگا۔"

پتہ نہیں، ان کا ماخذ کیا ہے؟

[2] ۱: ۵۹۔ [3] ص ۲۴-۲۳۔

وفد کے سرگروہ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن الحصین کا شمار شیخ الاسلام کے مخصوص شاگردوں میں تھا۔ شیخ کو خود ان پر بڑا اعتماد تھا، شیخ نے اپنی زندگی میں انھیں دوبار رئیس وفد بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا۔ شیخ کے بعد امیر عبد العزیز (ف ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) سعود بن عبد العزیز (ف ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) اور عبد اللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء) تینوں کے عہد حکومت میں منصب قضاء پر فائز رہے۔ سقوط درعیہ کے وقت (۱۲۳۳ھ) جب کہ یہ بہت ضعیف ہو چکے تھے، ابراہیم پاشا ان کے ساتھ بری طرح پیش آیا اور سخت کلامی بھی کی[1] فتح اور دنیوی سربلندی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اوروں کی طرح انہیں پھانسی نہیں دی گئی۔ ۱۲ رجب ۱۲۳۷ھ (۴ اپریل ۱۸۲۲ء) کو وفات پائی[2]

قحط سالی اور حج کی عام اجازت ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۵ء

"۱۱۹۷ھ میں عبد العزیز (حرسہ اللہ تعالیٰ) نے سرور والیٔ مکہ مشرفہ کو گھوڑے، سواریاں اور مختلف چیزیں ہدیۃً بھیجیں۔ اس تمام تعظیم و تکریم اور ہدایا سے اصل غرض، اہل دین و اسلام (یعنی اہل نجد، اتباع شیخ الاسلام مدظلہ العالی) کے لئے ادائے فرض (التزام الرکن الخامس) کی عام اجازت حاصل کرنا تھی، جس سے وہ سالہا سال سے روک دئے گئے تھے، اور جس کی بجا آوری کے لئے ان کے دل تڑپ رہے تھے ... تو اس سال سبھوں نے حج کیا، کوئی تین سو آدمی ہوں گے۔"[3]

ابن بشر نے اس کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ فلبی نے "اجازت" اور اس کے اسباب و نتائج پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۵ء کی قحط سالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

۱؎ عنوان: ۱/۱۹۱۔ ۲؎ مزید حالات اور شاگردوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عنوان المجد ۱/۹۴، ۹۱، ۲۳۲، ۲۳۳۔ ۳؎ روضۃ الافکار: ۲/۱۳۴۔

"........ تاہم (یعنی امیر عبد العزیز کی تمام کوششوں کے باوجود) اس قحط سالی سے جو دو سال تک رہی پورے عرب کو کافی نقصان پہنچا
قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جب شریف اعظم سرور نے وہابی حاکم کو اس پابندی کے اٹھائے جانے کی اطلاع دی[1] جو ان کے آزادانہ حج پر چند سال پہلے عائد کردی گئی تھی، تو قحط سالی کے سبب سے صرف تین سو آدمی فائدہ اٹھا سکے۔ وہابیوں کو حج کی دوبارہ اجازت اُس دور کی عربی تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ سرور عملاً قسطنطنیہ کے برائے نام Titular خلیفہ کے اقتدار سے بالکل آزاد ہو چکا تھا، اور اب اس نے عسیر اور نجد کے حدود کی طرف تاخت شروع کردی تھی۔ وہابیوں کے خلاف امتناع حج کا حکم بھی اس نے اپنی برتری منوانے کا ایک ذریعہ بنانا چاہا تھا، لیکن وہابیوں نے اس کی برتری تسلیم نہیں کی۔ اور امتناع حج کا بدلہ انھوں نے یہ لیا کہ عراق و فارس کے حاجیوں کے قافلے جو وہابی علاقے سے گزرتے تھے، نجدی دستوں کی چھیڑ چھاڑ کا شکار ہونے لگے۔ یہ شریف سرور کی طاقت سے باہر تھا کہ ان قافلوں کی حفاظت کا ذمہ لے سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد کے ترکی پاشا نے قافلوں کی روانگی روک دی۔ اس لئے کہ فارس کی حکومت صحراء کی تکلیفوں کا

---

[1] فلبی (ص ۳۸) کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شریف سرور (۱۱۸۶ھ - ۱۲۰۲ھ) نے ازخود اجازت دی تھی، حالانکہ ابن غنام کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبد العزیز کی سلسلہ جنبانی پر یہ اجازت ملی تھی:- وقصده بذلك التشریف والاكرام واهدائه ...... الرخصة لاهل الدین والاسلام فی اداء واجب الافتراض ...." الخ

الزام پاشائے بغداد ہی پر ڈالتی تھی۔ اُن دنوں حجاز کا سارا دارومدار انھیں قافلوں پر تھا، جو خشکی کے ذریعہ حج کو آتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے تاجروں نے تنگ آکر شریف کو نجدی حکومت سے تعلقات استوار کرنے پر مجبور کیا۔ سرور کے لئے جھکنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ اور گھوڑوں اور اونٹوں کا تحفہ جو وہابی حاکم نے قحط سالی کے سال شریف کو بھیجا، اس سے دونوں حکومتوں کے تعلقات کی شگفتگی سب لوگوں پر ظاہر ہوگئی ..... الخ۔

لیکن یہ اجازت بھی عارضی ثابت ہوئی۔[1]

دوسرا نجدی وفد: ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء	شریف سرور کا انتقال ۱۲۰۲ھ میں ہوا، اس کے بعد عبد المعین بن مساعد والی ہوا، پھر غالب بن مساعد امیر مقرر ہوا۔ یہی شریف غالب

ہے، جس کے عہد میں اہل نجد اور حجازیوں اور مصریوں کے درمیان معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ مورخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کشمکش سے بچنا چاہتا تھا، لیکن علماء نے صلح نہ ہونے دی۔

واقعہ کچھ بھی ہو، شریف غالب (۱۲۰۲ھ۔ ۱۲۳۸ھ) کی معاملہ فہمی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لینے کے کچھ ہی بعد (دو برس بعد) امیر عبد العزیز سے ایک ایسے عالم کی فرمائش کی، جو شیخ الاسلام کی دعوت پر گفتگو کر سکے۔ امیر

---

[1] Arabia : صفحہ ۳۸-۳۹ Mordtmann (مقالہ ابن سعود: انس۔ اسلام) کے بیان کے مطابق سرور کی دی ہوئی اجازت غالب نے ۱۲۰۲ھ میں چھین لی۔ عام طور پر مؤرخ لکھتے ہیں کہ اجازتیں عارضی رہیں اور اہل نجد پر حج کے سلسلہ میں امتناعی احکام جاری رہے، تاآنکہ ۱۲۰۵ھ سے باضابطہ جنگ شروع ہوگئی۔ (الرحلة الحجازیة، ص ۸۸)۔

عبدالعزیز نے خوشی خوشی دعوت قبول کی اور شیخ عبدالعزیز بن الحصین کو (جو پہلے وفد کے رئیس بنا کر بھیجے گئے تھے) اس خدمت پر مامور کیا۔ خود شیخ الاسلام نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر ایک خط دیا۔ جس میں پہلے وفد کے حوالے کے ساتھ وہ دلیلیں تفصیل سے بیان کی گئیں، جن سے اُس وقت علمائے مکہ مطمئن ہو گئے تھے۔

غالب نے شیخ عبدالعزیز بن الحصین کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ دیر تک گفتگو کی اور ان کے دلائل کی اہمیت اور سچائی تسلیم کی۔ لیکن مقامی علماء کے بہکانے سے وہ اپنے خیال سے پھر گیا۔ "فقیہانِ حرم" نے اسے یہ سوجھایا کہ "تم نے ابن سعود کی اطاعت قبول کی تو شریفی امارت پر ابن سعود کا قبضہ ہو جائے گا"۔ بات لگتی ہوئی تھی، غالب کے دل سے لگ گئی اور نجدی اقتدار کے ہوّے نے اسے قبولِ حق سے باز رکھا، جس کا خمیازہ تمام دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا۔ شیخ عبدالعزیز نے اصرار بھی کیا کہ مقامی علماء کی ایک مجلس ترتیب دی جائے اور مختلف فیہ مسئلوں پر کھل کر گفتگو کی جائے۔ لیکن مقامی علماء اس پر راضی نہ ہوئے اور انھوں نے صاف صاف اعلان کیا:۔

"ان وہابیوں کے ساتھ کوئی گفت وشنید بے کار ہے، کہ ان کے عقائد ہمارے اسلاف کے عقائد کے بالکل برعکس ہیں"۔

اگر فقیہانِ حرم کا رویہ ناعاقبت اندیشانہ نہ ہوتا، اور شریف غالب اور امیر عبدالعزیز کے درمیان مفاہمت ہو جاتی، تو مسلمانوں کا کتنا قیمتی خون ضائع ہونے سے بچ جاتا![۵۱]

تعجب ہے کہ ابن بشر نے اس قدر اہم واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

---

[۵۱] روضۃ الافکار، ۲، ۱۶۲-۱۶۳۔

تیسرا نجدی وفد: دوسرے وفد کی ناکامی کے بعد طرفین میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔
۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۱ء میں خود غالب نے پہل کی۔ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔

درمیان میں صلح بھی ہوتی رہی۔ اس اثناء میں نجدی فوجیں جزیرۃ العرب کے باقی علاقوں میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتی رہیں۔ تا آنکہ ۱۲۱۱ھ میں انھوں نے احساء کے پاس جزیرہ عمائر پر حملہ کیا اور کامیاب لوٹے۔[۱] نجدی طاقت کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شریف غالب نے ایک مرتبہ پھر سلسلہ جنبانی کی۔ امیر عبد العزیز کو ایک خط بھیجا اور ایک ایسے نجدی عالم کے بھیجنے کی درخواست کی، جو موحدین کا مسلک اہل مکہ کے سامنے پیش کر سکے۔ پہلے دونوں وفد شیخ الاسلام کی زندگی میں اور ان کی ہدایتوں کا نوشتہ ساتھ لے کر گئے تھے۔ تیسرے وفد کا مطالبہ ان کے انتقال (۱۲۰۶ھ) کے بعد ہوا۔ تاہم امیر عبد العزیز بن محمد بن سعود نے فوراً دعوت قبول کر لی، اس لئے کہ اسے تبلیغ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں تھی۔ شیخ الاسلام کے ایک ممتاز شاگرد شیخ احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر اس خدمت پر مامور ہوئے۔ احمد بن ناصر اور ان کے ساتھی پہلے طواف سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد امیر عبد العزیز کے تحفے شریف کی خدمت میں پیش کئے۔ ان کا استقبال نہایت دوستانہ ہوا اور مسلسل کئی دنوں تک مقامی علماء سے گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں شیخ احمد بن ناصر کی خدمت میں کچھ سوالات پیش ہوئے اور تحریری جواب کا مطالبہ کیا گیا۔ شیخ احمد بن ناصر نے مفصل اور مدلل تحریری جواب دیا جو ایک رسالے کی صورت میں "الفواکہ العذاب فی الرد علی من لم یحکم السنۃ والکتاب" کے نام سے چھپ گیا ہے۔[۲] اس رسالے میں خاص طور پر دو مسئلوں سے بحث کی گئی ہے:۔

---

[۱] عنوان المجد: ۱، ۱۱۰۔ [۲] مجموعۃ الہدیۃ السنیۃ، ص ۹۰-۵۵

(۱) شفاعت اور استغاثہ۔

(۲) تارکین صلاۃ کی تکفیر اور ان سے قتال۔

(آگے چل کر ان مسئلوں پر تفصیلی گفتگو ہوگی، اس لئے یہاں اس رسالہ کے موضوعِ بحث کو چھیڑنا مناسب نہیں۔)

یہ مناظرہ رجب ۱۲۱۱ھ میں غالب کے سامنے بھری مجلس میں ہوا تھا۔ ابن غنام نے ۱۲۱۱ھ کے حوادث، کے ضمن میں قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"وہ (علمائے مکہ مکرمہ) شیخ احمد بن ناصر کے دلیلوں کی قوت تسلیم کرنے کے باوجود قبولِ حق پر آمادہ نہ ہوئے:۔

"انھم اعترفوا باستقامۃ حجۃ ومع ذٰلک جحدوا" الخ

ابن غنام نے پورا رسالہ بھی نقل کر دیا ہے۔[۱] فلبی[۲] نے بھی اس وفد اور مناظرہ کی پوری روداد درج کی ہے۔ تعجب ہے کہ ابن بشر نے اس وفد کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا۔

وفد کے رئیس شیخ احمد بن ناصر بن معمر کے متعلق بھی دو حرف لکھنا نامناسب نہ ہوگا۔ پہلے اور دوسرے وفد کے رئیس شیخ عبد العزیز الحصین (ف ۱۲۳۷ھ) کی طرح یہ بھی شیخ الاسلام کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ شیخ الاسلام کے علاوہ ان کے بھائی سلیمان بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) اور ان کے شاگرد و سیرت نگار ابن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ درعیہ میں عرصہ تک عہدہ قضا پر مامور رہے۔ امیر سعود بن عبد العزیز (۱۲۱۸-۱۲۲۹) نے انھیں درس و افتاء کے لئے مکہ مکرمہ بھیجا تھا، اور وہیں وفات پائی۔[۳] (وسط ذی الحجہ ۱۲۲۵ھ آغاز جنوری ۱۸۱۱ء)۔

---

[۱] روضۃ الافکار: ۲، ۲۲۶-۲۴۱۔ [۲] Arabia صفحہ ۶۲-۶۱۔ [۳] عنوان المجد: ۱، ۱۵۲

جنگ کے بعد صلح: سنہ ۱۲۱۳ھ

اب نجدی وہابیوں کی کامیابیاں اتنی بڑھیں کہ باب عالی[۱] کو بھی فکر دامنگیر ہوئی۔ سلیمان پاشا، والی بغداد کے ذمہ یہ مہم کی گئی۔ سلیمان نے ثوینی اور علی پاشا کی سرکردگی میں بالترتیب فوجیں[۲] بھیجیں، جو ناکام واپس آئیں۔ پھر کیا تھا، نجدی فوجیں عراق کی سرحد پر مسلسل دھاوے کرنے لگیں۔ امیر عبدالعزیز نے بڑھ کر بحرین اور سواحل عمان پر قبضہ کر لیا، جو بصرہ اور بغداد کے ترک حاکموں کے حملوں کے باوجود مستحکم ہوتا گیا۔

نجدیوں پر امتناع حج کی پابندی اور بدلے میں ان کا عراق پر حملہ اور عراقی قافلے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا اشراف مکہ کے لئے ہمیشہ خلجان کا باعث رہا۔ اور اسی دباؤ سے مجبور ہو کر انھوں نے بارہا حج کی عارضی اجازت دی اور وفود طلب کئے، پھر فوج کشی کی ٹھانی۔ غالب کا یہ رویہ برابر قائم رہا، اور اس نے سنہ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء، ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء اور ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں مسلسل تیاریوں کے بعد حملے کئے اور ہمیشہ ناکام رہا[۳]۔ آخری سخت معرکہ سنہ ۱۲۱۲ھ[۴]

---

۵۱ سنہ ۱۲۱۳ھ میں غالب نے خاص طور پر دولت علیہ کو وہابیوں کی "سرکوبی" کی طرف توجہ دلائی، لیکن دولت علیہ نے کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے سلیمان پاشا، بغداد کا حاکم، اہل نجد کے مقابلہ میں فوج کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد سنہ ۱۲۱۳ھ میں تو خود دحلان کے بیان کے مطابق سلیمان کے نائب علی پاشا نے ایسی چڑھائی کی تھی کہ "اگر ان کی زندگی نہ باقی ہوتی تو وہابیوں کا یقینی خاتمہ ہو گیا تھا" (خلاصۃ الکلام: ص ۲۶۸-۲۶۶)۔

۵۲ سنہ ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء اور ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء؛ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عنوان المجد: ۱، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۸؛ فلبی: ص ۶۸-۷۰

۵۳ عنوان المجد: ۱، ۸۷-۸۶، ۱۰۷-۱۰۳، ۱۱۲-۱۱۳؛ فلبی: صفحہ ۵۳-۵۱، ۶۴، ۷۳-۷۴

۵۴ یہ معرکہ جو وقعۃ الخرمۃ کے نام سے مشہور ہے، شوال ۱۲۱۲ھ (مارچ اور اپریل سنہ ۱۷۹۸ء) میں پیش آیا۔ غالب شکست کھا کر ۳ ذی القعدہ - ۱۹ اپریل ۱۷۹۸ء کو مکہ واپس ہوا (خلاصۃ الکلام ۲۶۴)

میں پیش آیا۔ اور غالب کو خرمہ (تربہ کے قریب ایک مشہور گاؤں) کے مقام پر بُری شکست ہوئی۔ اور اس کے ہزاروں آدمی کام آئے۔ تو اس کے لئے صلح جوئی اور حج کی اجازت دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ دونوں علاقوں کے درمیان حد بندی کردی گئی۔ عتیبہ، حرب اور عسیر کا شمالی علاقہ شریف کے حدودِ مملکت میں رہا۔ یہ صلح آخر جمادی الاولیٰ ۱۲۱۳ھ / دسمبر ۱۷۹۸ء میں ہوئی[1]۔ اور ۱۲۱۳ھ سے ۱۲۱۵ھ تک نجدی حجاج، اور ان کے ساتھ عراقی قافلے، امن و امان کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرتے رہے۔

حج : ۱۲۱۳ھ | "خرمہ کے واقعہ کے بعد شریف نے عبدالعزیز کے پاس قاصد بھیجا اور صلح کی خواہش کی، جسے امیر نے قبول کیا اور شریف نے اہل نجد کو حج کی اجازت دی۔

اس سال نجد کا ایک قافلہ حج سے مشرف ہوا جس میں شیخ الاسلام کے دو فرزند علی بن محمد اور ابراہیم بن محمد بھی تھے[2]۔ دونوں کے درمیان عہد و پیمان مکمل ہو گئے۔ جنگ کی موقوفی اور امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔ وہابیوں کو حج بیت اللہ کی اجازت ملی۔ اور لوگوں کو ان کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنے سے روک دیا گیا۔ تو ہر طرف سے وہ مکہ کی طرف لپکے۔ اللہ تعالیٰ کی بھی عجب شان ہے (!!)[3]

---

[1] خلاصۃ الکلام صفحہ ۲۶۷۔

[2] عنوان: ۱/ ۱۲۰۔

[3] خلاصۃ الکلام صفحہ ۲۶۸۔

احمد دحلان، حمد بن ناصر کے حج کا بھی ذکر کرتا ہے، لیکن ابن بشر، دوسرے اعیان کے ضمن میں ان کا نام نہیں لیتا۔

اس سال خود امیر عبدالعزیز یا سعود بن عبدالعزیز حج سے مشرف نہ ہو سکے۔ سلیمان پاشا نے اپنے نائب علی پاشا کی سرکردگی میں عظیم الشان فوج ان کے مقابلہ کے لئے بھیجی تھی۔ اس مہم کی تیاریوں میں دونوں باپ بیٹے الجھے رہے۔ یہ رمضان۔ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء کا ذکر ہے۔

حج: ۱۲۱۴ھ اس سال سعود بن عبدالعزیز پہلی مرتبہ حج سے مشرف ہوا۔ اہل نجد جنوب الاحساء اور بدووں کی ایک بڑی تعداد وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ حج بہت شاندار طریقہ پر ادا ہوا۔ نہایت اچھی طرح عمرہ ادا کیا اور حج سے فارغ ہوئے کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور امن وامان سے واپس آئے۔ وللہ الحمد والمنۃ[51]

اور ۱۲۱۴ھ میں سعود بن عبدالعزیز نے حج کیا۔ اس کے ساتھ بے شمار آدمی تھے (قدوم کالرمال) مولانا شریف اور وہ ایک خیمہ میں ملے جو ان کے لئے ابطح میں نصب کیا گیا تھا۔ ۲۸ ذی الحجہ مئی ۱۸۰۰ء کو واپس ہوا۔[52]

حج: ۱۲۱۵ھ اس سال عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے خود زیارت بیت اللہ کا قصد کیا تھا۔ اور اہل نجد و اطراف نجد کی بڑی تعداد لے کر وہ روانہ ہوئے لیکن سات دن برابر سفر کے بعد وہ چور ہو گئے اور سعود بن عبدالعزیز کے اصرار پر وہ لوٹ گئے اور امیر سعود بن عبدالعزیز نے تزک واحتشام کے ساتھ حج کیا۔ ہزاروں ہزار

---

۵۱ عنوان المجد: ۱/۱۲۰۔

۵۲ خلاصۃ الکلام: صفحہ ۲۶۸۔

صدقات اور بخشش کے طور پر تقسیم کئے۔ یہ ان کا دوسرا حج تھا[1]

ان دونوں سالوں میں حج کے قافلے نجد کے حدود سے ہو کر امن و امان سے گذرے۔ خود سعود بن عبد العزیز نے بہ نفس نفیس نگرانی کی، دوسرے سال عمان کا فرماں روا بھی حج سے مشرف ہوا[2]۔

۱۲۱۲ھ سے ۱۲۱۵ھ تک واقعات اور حج کی یہ ترتیب مستند ماخذ سے لی گئی ہے امیر شکیب کے بیان[3] میں غالباً کسی یورپی ماخذ پر اعتماد کے باعث ترتیب الجھ گئی ہے اور صلح و حج کے سنین کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح مارد تمان کے مقالے[4] میں گو سنین ٹھیک ہیں، لیکن ترتیب الٹی پلٹی ہے۔

کربلاء پر حملہ ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۲ء نجدیوں کے حملۂ کربلاء و نجف اور بلد الحسین کی بے حرمتی کی داستان بہت کچھ رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ہم یہاں صحیح ترین واقعات مختصر طور پر درج کرتے ہیں:-

"حجاج کے قافلوں پر واپسی میں عراق کے قبیلوں نے حملہ کیا۔ جنہیں یقینی طور پر اوپر سے اس کی ہدایت تھی تاکہ وہابیوں کے قافلہ کے انتظام اور ان کی ذمہ داری پر حرف لگایا جا سکے... لیکن وہابیوں کے تعلقات بغداد اور اشراف کے ساتھ زیادہ دنوں تک دوستانہ نہ رہ سکے۔ سعود بن عبد العزیز نے شہر کربلاء پر ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ (۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء) کو حملہ کیا، تاکہ شیعی قبیلہ خزاعل کے وہابی قافلہ پر حملہ کا انتقام لیا جا سکے[5]...." (مارد تمان)

---

[1] عنوان: ۱/ ۱۲۱۔ [2] قبلی: ص ۸۱۔ [3] حاضر العالم الاسلامی: ۴/ ۱۶۳-۱۶۲۔

[4] مقالہ ابن سعود مندرجہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ [5] قبلی: ص ۸۱؛ مارد تمان کا مقالہ

اور اس سال (۱۲۱۶ھ) سعود تمام نجد، جنوب، حجاز اور تہامہ سے ایک جرار لشکر لے کر کربلا کے ارادہ سے چلا اور بلد الحسین کے باشندوں پر حملہ کیا۔ یہ ذی القعدہ کا واقعہ ہے۔[51] مسلمانوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ اس کی دیواروں پر چڑھ گئے، اور زبردستی (عنوۃً) داخل ہو گئے اور اکثر باشندوں کو گھروں اور بازاروں میں تہ تیغ کر دیا۔ اور اس قبہ کو جو ان کے اعتقاد کے مطابق حسین (رضی اللہ عنہ) کی قبر پر بنایا گیا تھا، ہدم کر دیا۔ قبہ اور اس کے آس پاس اور چڑھاوے (النصیبۃ التی وضعوھا علی القبر) کی تمام چیزیں لے لیں قبہ۔ زمرد، یاقوت اور جواہر سے آراستہ تھا، اور اس کے علاوہ شہر میں جو کچھ مال ومتاع (ہتھیار، لباس، سونا، چاندی، قیمتی مصاحف اور بے شمار چیزیں) ملا، سب لے لیا اور شہر میں ایک پہر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ (ولم یلبثوا فیھا الا ضحوۃ)" اور ظہر کے وقت تمام مال لے کر وہاں سے نکل آئے اور اس کے باشندوں میں سے تقریباً دو ہزار آدمی قتل کئے گئے۔"[52]

اس واقعہ سے اہل نجد کی کتنی ہی تسکین کیوں نہ ہوئی ہو، لیکن عام مسلمانوں خاص کر ایران کے شیعوں میں اس سے بڑی برہمی پھیلی۔ کہا جاتا ہے کہ "فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء - ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ نجد پر فوج کشی کرنا چاہی

---

۵۱ ذی القعدہ ۱۲۱۶ھ (مارچ ۱۸۰۲ء) غالباً روانگی کی تاریخ ہے۔ اصل میں "وفیھا ساد سعود بالجیوش۔ وذلک فی ذی القعدۃ" ہے۔ ماردتمان نے حملہ کی صحیح تاریخ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ (۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء) دی ہے، جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔

۵۲ عنوان المجد: ۱، ۱۲۲-۱۲۱۔

تھی، اور سلیمان پاشا، حاکم بغداد بھی ایک بڑی فوج تیار کر رہا تھا، لیکن اہل ایران کی روس سے چھڑ گئی اور سلیمان، کردوں کی ایک بغاوت فرو کرنے میں اُلجھ گیا، اس لئے ان کے ارادے پورے نہ ہو سکے۔[۱]

فتح علی شاہ قاچار، شاہ ایران کی برہمی تو بالکل قرین قیاس ہے، لیکن نجد پر فوج کشی کے ارادے کی تصدیق دوسری تاریخوں سے نہیں ہوتی۔ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ کے ایک مخطوطہ[۲] سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس میں امیر سعود بن عبد العزیز کی طرف سے فارسی میں فتح علی شاہ قاچار کے نام ایک خط ہے، جس میں باشندگانِ نجف کے مشرکانہ اعمال کی بُرائی کے ساتھ ساتھ ان کے قتل کا بھی ذکر ہے۔ نیز یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اگر فتح علی شاہ نے ان برائیوں کے قلع قمع کرنے کی کوشش نہ کی، تو امیر نجد کو مجبوراً سخت کارروائی کرنا پڑے گی۔ اس خط کے ساتھ فتح علی شاہ کا جواب بھی ہے، جس میں شاہ قاچار نے امیر نجد کو تنبیہ اور ان "مظالم" سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ 'خط' سے پہلے 'مختصر الفاظ میں شیخ الاسلام کی دعوت' کی تشریح (افادات) ہے۔ یہ افادات، سعود بن عبد العزیز کی طرف سے ہیں، اور اصل مکتوب امیر عبد العزیز بن محمد بن سعود کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ حملۂ کربلا کے وقت امیر عبد العزیز حکمران تھا اور سعود بن عبد العزیز ولی عہد اور سپہ سالار، اس لئے دونوں کا نام ہونا قرین قیاس بھی ہے۔

یہ مختصر مخطوطہ ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء کا لکھا ہوا ہے، یعنی واقعہ کے صرف تین سال بعد

---

[۱] حاضر العالم الاسلامی: ۴، ۱۶۳۔ [۲] فہرست مشروح انگریزی Catalogue Raisonne: ۱۴، ۱۳۳۷۔

اس کی کتابت ہوئی ہے۔ خطوط پر تاریخ درج نہیں بہرحال وہ حملہ کربلاء سے متصل ہی لکھے گئے ہیں، اور اس میں فتح علی شاہ کے مجوزہ حملہ کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر ہمیں فلبی کے بیان[1] سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۵ء میں فتح علی شاہ اور سعود بن عبد العزیز کے تعلقات اچھے اور دوستانہ تھے اس لئے ہم شاہ ایران کے مجوزہ حملہ نجد کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

رہا سلیمان پاشا، حاکم عراق کا حملہ، سو اس کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ سنہ ۱۲۱۷ھ میں یعنی حملہ کربلاء کے کچھ ہی بعد اس کا انتقال ہو گیا۔[2]

صلح کا خاتمہ: سنہ ۱۲۱۷ھ

واقعہ خرمہ کے بعد جو صلح فریقین کے درمیان ہوئی تھی، وہ بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ شریف غالب کو نجدی فوجوں کی زیادتی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی شکایت ہوئی۔ خطوط سے مسئلہ طے نہ ہوا تو شریف نے اپنے وزیر عثمان مضایفی کو گفت و شنید کے لئے بھیجا، لیکن وہ وہاں جا کر ان کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ اور واپسی پر اپنے نئے حلیفوں کی طرف سے غالب کو دعوت مبارزت دی۔

ادھر غالب اور اس کے بھائی عبد المعین میں ان بن ہو گئی۔ عبد المعین نے سعود سے مدد طلب کی۔ طائف کے قریب ایک جھڑپ ہوئی۔ پھر غالب طائف میں قلعہ بند ہو گیا، لیکن اسے زک اٹھانا پڑی۔ اور طائف پر سعودی فوج کا قبضہ ہو گیا، اور عثمان مضایفی حجاز کا حاکم مقرر ہوا۔[3] اور

---

[1] Arabia :- صفحہ ۹۰ [2] عنوان المجد: ۱، ۱۲۲۔

(۱) اواخر سنہ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۳ء۔

نجدی فوجیں اطراف و نواح میں پھیل گئیں، اب ان کا رخ مکہ مکرمہ کی طرف تھا۔

حج کا موسم قریب تھا، شامی قافلہ عبداللہ پاشا کی سرکردگی میں حرم سے صرف تین دن کے فاصلہ پر آ کر رکا، سعود سے صلح ہو گئی۔ شرطیہ ہوئی کہ قافلہ تین دن میں مراسم حج سے فارغ ہو کر الٹے پاؤں واپس چلا جائے۔ غالب نے عبداللہ پاشا سے درمیان میں پڑنے کی درخواست کی، لیکن وہ شرط کے مطابق حج سے فارغ ہوتے ہی واپس ہو گیا، اور غالب کی التجا بے کار ہو گئی۔[۱]

مکہ مکرمہ کا فاتحانہ داخلہ
محرم ۱۲۱۸ھ (اپریل ۱۸۰۳ء)

حج کے ختم ہوتے ہی غالب نے جدہ جا کر پناہ لی اور سعود بن عبدالعزیز، یوم شنبہ ۸ محرم الحرام (۳۰ اپریل ۱۸۰۳ء)[۲] کو ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ داخل ہوا۔ باشندوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ امیر سعود بن عبدالعزیز نے غالب کے بھائی عبدالمعین کو مکہ مکرمہ کا امیر مقرر کیا، اور خود "اصلاح" کی طرف توجہ کی۔

"۔۔۔ سعود نے باشندوں کو امان دی اور صدقات و عطیات دل کھول کر تقسیم کئے۔ جب سعود اور 'مسلمان'، طواف اور سعی سے فارغ ہوئے، تو اہل نواحی، قبوں اور 'شرکیہ مشاہد' کے انہدام پر مامور کئے گئے۔

مکہ کے ہر حصہ میں اس قسم کی چیزیں بہ کثرت تھیں سعود نے کوئی بیس دن قیام کیا۔ اور اس دوران میں 'مسلمان'، ان قبوں کو گراتے رہے۔ تا آنکہ مکہ

۱؎ عنوان: ۱، ۱۲۲/۲؛ فلبی: ۸۳۔

۲؎ ڈکشنری آف اسلام (ص ۶۶۰) میں داخلۂ مکہ کی تاریخ ۲۷ اپریل دی گئی ہے، جو غلط ہے۔ غالباً زویمر (ص ۱۹۴) نے بھی اسی سے یہ غلطی نقل کی ہے۔

مکہ کے تمام "مشاہد" اور "قبے" زمین کے برابر کردئے گئے۔[1]

سعود، عبد المعین کو "امیر" بنا کر، خود حرم کو مشرکانہ آلودگیوں سے پاک کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا، کعبہ کے جواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کردئے گئے۔ قبے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کئے گئے۔[2]

ابن بشر جواہرات کی تقسیم اور مجاوروں کے قتل کا بالکل ذکر نہیں کرتا۔

یہ سعود کے داخلۂ مکہ کا ایک رخ تھا، جو شاید عام لوگوں کے نزدیک مقبول نہ ہو، اس "فتح" کا دوسرا "رخ" بھی ملاحظہ ہو۔ ایک پادری (Hughes) کا بیان ہے:-

"حرم کی تقدیس کے باعث باشندوں کو ادنی گزند نہیں پہنچا۔ اور اہل نجد کے صاحب "امر" ہونے کے بعد مسجدیں اس طرح آباد ہوئیں کہ "بلد امین" میں طاعت وزہد کی یہ مثال، عہد نبوت کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔"[3]

ایک اور یورپی معاصر (برک ہارٹ) لکھتا ہے:

"مقدس شہر میں داخل ہونے پر فوج نے کوئی ناروا حرکت نہیں کی تمام دکانیں دوسرے روز کھل گئیں اور فوجیوں نے ضرورت کی تمام چیزیں نقد قیمت دے کر خرید کیں۔"[4]

ایک دوسری جگہ یہی برک ہارٹ لکھتا ہے:-

---

[1] عنوان: ۱/ ۱۲۲ – ۳و۲ [2] فلبی: ص ۸۳،

[3] ڈکشنری آف اسلام: ص ۶۶۰ [4] Notes on Bedouins etc.: ج ۲ ص ۱۹۵

نیز Brydge کی کتاب A Brief History of the Wahhaby

"اہل مکہ اب تک سعود کا نام جذبۂ امتنان کے ساتھ لیتے ہیں، مختلف زیارتوں اور حج کے موقعوں پر فوج کا قابلِ تعریف رویہ، خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے، بلد الحرام میں پہلے داخلے کے وقت اس کی سپاہ کا منصفانہ برتاؤ اب تک ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا۔"[1]

اس کے علاوہ نماز باجماعت کی پابندی پر مجبور کیا گیا اور ریشمی کپڑے اور تمباکو کے آلات ضائع کر دئیے گئے، غیر اسلامی ٹیکس اور چنگیاں روک دی گئیں[2]۔ مکرر جماعتیں بھی روک دی گئیں۔ اور مختلف فقہی مذاہب کے علماء مختلف وقتوں میں امامت کرنے لگے[3]۔

اہل نجد کے عقائد اور طریقِ عمل کی توضیح کے لئے شیخ عبداللہ بن شیخ الاسلام کے قلم سے لکھوا کر ایک رسالہ عام طور پر تقسیم کیا گیا[4]۔ اس رسالے میں قبوں اور زاویوں کے انہدام کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے، نیز دوسرے مختلف فیہ مسئلوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ دحلان[5] کے بیان کے مطابق، شیخ الاسلام کے رسالہ کشف الشبہات کے پڑھنے پڑھانے کا بھی حکم ہوا۔

ابھی غالب کے جدہ میں پناہ لینے کا ذکر آچکا ہے۔ مکہ مکرمہ میں صرف چودہ دن قیام کے بعد سعود نے اس کا تعاقب کیا، (۲۲ محرم ۱۲۱۸ھ) لیکن جدہ میں ناکام رہا، اس کی سپاہ پلیگ کا شکار ہو گئی۔ مجبوراً اسے سردست حجاز کا خیال چھوڑنا پڑا۔

۱؎ ج ۲: ص ۱۴۹ ۲؎ الہدیۃ السنیہ: ص ۴۳

۳؎ خلاصۃ الاحکام، ص ۲۷۸ ۴؎ الہدیۃ السنیۃ، ص ۴۵-۴۱-

۵؎ خلاصۃ الکلام ص ۲۷۹ -

مکہ میں اس کے دو سو آدمی رہ گئے تھے، جو بری طرح ذبح کئے گئے۔[51]

امیر عبدالعزیز کی شہادت رجب ۱۲۱۸ھ

۱۸ رجب ۱۲۱۸ھ (۴ نومبر ۱۸۰۳ء) کو امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود حسب معمول درعیہ میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا، کہ عین سجدہ کی حالت میں ایک جفاکار نے اسے خنجر سے شہید کر دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قاتل کوئی ایرانی یا کردی[52] شیعہ تھا، جس کے کئی لڑکے کربلاء میں نجدیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، اور وہ انتقام کے ارادہ سے درعیہ میں قیام پذیر تھا۔ غریب صورت اور درویش منش پاکر امیر عبدالعزیز نے اس کی کافی خاطر و مدارات بھی کی۔ ایک سال انتظار کے بعد آخر اسے موقع ملا، اور امیر عبدالعزیز کا کام تمام کرکے اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء سے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء تک کل انتالیس سال حکومت کی، اور اس حکومت کا بیشتر حصہ خود شیخ الاسلام کی نگرانی میں گزرا۔ ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء تک عبدالعزیز نے نمایاں حیثیت تو اپنے والد ہی کے عہد میں حاصل کرلی تھی اور تمام اہم معرکے (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء سے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) اسی کی قیادت میں سر ہوئے تھے۔ بالکل

[51] حاضر العالم الاسلامی: ۴، ۱۶۲؛ فلبی: ص۸۳۔

[52] عام مؤرخ قاتل کو ایرانی شیعہ بتاتے ہیں (فلبی: ۸۲؛ حاضر: ۴، ۱۶۳) لیکن ابن بشر (۱، ۱۲۴) کردی بتاتا ہے اور پھر "قیل" کے ساتھ "شیعی" بھی کہتا ہے۔ یہ "قیل" اس لئے کہ کرد شیعہ نہیں بلکہ کٹر سنی ہیں (... واللہ اعلم لان الاکراد لیسوا باھل رفض ولا فی قلوبھم غل علی المسلمین: ۱، ۱۲۴) ابن بشر اس قاتل کا نام عثمان بتاتا ہے، جو موصل کے پاس ایک قصبہ عماریہ کا رہنے والا تھا۔

اسی طرح جیسے اس کے دورِ حکومت میں تمام اہم لڑائیاں اس کے ولی عہد سعود بن عبدالعزیز کی سرکردگی میں لڑی گئیں۔ امیر عبدالعزیز نے خود شیخ الاسلام کی صحبت اٹھائی تھی، اس لئے تبلیغ و دعوت کا شوق اس کے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ جو علاقہ فتح ہوتا، وہاں وہ سب سے پہلے مبلغین اور متطوعین کا تقرر کرتا۔ رعایا پر رحم دلی اس کی خمیر میں داخل تھی۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں، اس کے محاسن و معمولات، ابن بشر[۵۱] نے اچھی طرح بیان کئے ہیں، ہم صرف قاضی محمد بن علی شوکانی (پ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء - م ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء) کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں۔ شوکانی، امیر عبدالعزیز کے معاصر تھے، اور ان پر شیخ الاسلام[۵۲] کی ہم مشربی کا "الزام" بھی نہیں عائد کیا جا سکتا:-

"... جو اس کی حکومت میں داخل ہوتا، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور تمام شعائر اسلام کا پابند ہو جاتا۔ اس کے حلقہ طاعت میں شام ... کے عرب داخل ہوئے اور فرائض دین کے سخت پابند ہو گئے، حالانکہ اس سے پہلے وہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے، اور غلط سلط کلمۂ شہادت ادا کرنے کے سوا کوئی رکن ادا نہیں کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے وہ بالکل جہالت میں گھرے ہوئے تھے اور اب نمازیں وقت پر ادا کرنے لگے ہیں[۵۳]۔"

برک ہارٹ[۵۴] نے بھی اس کی تبلیغی کوششوں، قاضیوں کا تقرر، قاضیوں کی انصاف پرستی وغیرہ کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

---

۵۱ ۱، ۱۲۸ - ۱۲۴۔ ۵۲ ملاحظہ ہو: باب چہارم: "دعوت" اور باب پنجم: "غلط بیانیاں"۔

۵۳ البدر الطالع: (۲، ۵)۔

۵۴ صفحہ ۲۶۔

سعود بن عبدالعزیز
۱۲۱۸ھ - ۱۲۲۹ھ
۱۸۰۳ء - ۱۸۱۴ء

امیر عبدالعزیز کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا سعود امیر مقرر ہوا۔ سعود کے لئے امارت کی بیعت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں انہی کی ایماء سے لی جا چکی تھی۔[1]

سعود زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر دعوت و حکومت کی توسیع میں سرگرم ہو گیا۔ اور دُور دراز کے فوجی مہمات کی سرکردگی، اپنے بیٹے عبداللہ کے سپرد کی۔ عبداللہ نے ایک طرف حجاز میں خیبر کو سرنگوں کیا، اور دوسری طرف بحرین، عمان اور راس الخیمہ تک اپنی فتوحات کی دھاک بٹھادی۔

اب بابِ عالی کو بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ علی پاشا حاکم عراق، عبداللہ پاشا حاکم دمشق اور شریف پاشا، حاکم جدہ، تینوں کو اس خطرہ کی بیخ کنی کا حکم ہوا۔ عراق میں عربوں اور کردوں کی ایک بڑی فوج تیار کی گئی، لیکن یہ تیاریاں وقت پر مکمل نہ ہوئیں، ادھر سعود کو موقع ملا، اور اس نے بصرہ پر دھاوا کر دیا۔ علی پاشا، حلہ میں قلعہ بند تھا، اسے چھوڑ کر نجدی فوجیں زبیر پر حملہ آور ہوئیں اور وہاں کے تمام قبے اور غیر شرعی مشاہد گرا کر واپس ہوئیں۔[2] سعود تو کامیاب لوٹا اور علی پاشا کردستان کی ایک بغاوت فرو کرنے میں اُلجھ گیا اور اس کی مہم ناکام رہی۔[3]

مکہ مکرمہ کی دوبارہ فتح
۱۲۲۰ھ
۱۸۰۶ء

اب سعود کو ہر طرف سے اطمینان ہو گیا۔ عمان اور ساحلی علاقے اس کی برتری اور اقتدار تسلیم ہی کر چکے تھے۔ عراق کی طرف سے

---

[1] $\frac{۱۲۰۲}{۱۷۸۸}$؛ روضۃ الافکار: ۲، ۱۵۴؛ عنوان المجد: ۱، ۸۳۔

[2] ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ / مارچ۔ اپریل ۱۸۰۴ء۔

[3] عنوان: ۱، ۱۳۰؛ فلبی: ۸۷۔۸۶۔

جو اطمینان ہوا تو اس نے پھر حجاز کو زیر نگیں کرنے کا تہیہ کیا۔[1] عثمان مضایفی نے بلا پس و پیش طائف پر قبضہ کر لیا، اور ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء کے آغاز میں اہل مدینہ نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اور "سمع و طاعت" کا عہد کیا۔ حسب دستور مدینہ منورہ میں عام قبروں کے قبے اور زیارت گاہیں منہدم کر دی گئیں۔[2]

اس اثناء میں نجدی فوجیں، جو آس پاس کے تمام علاقوں پر قابض ہو چکی تھیں، مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حج کا زمانہ قریب آ گیا تھا، شامی قافلہ محاصرہ کی وجہ سے رک گیا۔ ادھر اہل مکہ پریشان ہوئے، مجبوراً غالب نے امان طلب کی اور سعود کی اطاعت کا عہد کیا۔[3] شامی قافلہ کو حج کی اجازت ملی، غالب نے اطاعت کے ثبوت میں سعود کے پاس تحفے بھیجے اور اس نے اپنے سرداروں عبدالوہاب ابو نقطہ اور عثمان مضایفی کے منظور کردہ صلح کی تصدیق کی۔ پھر کیا تھا "امن و خوش حالی کا دور دورہ ہوا، قحط سالی ختم ہوئی، اور تمام راستے پر امن ہو گئے۔[4]"

---

[1] ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ/فروری ۱۸۰۵ء۔ [2] عنوان: ۱/ ۱۳۵؛

اسٹاڈرڈ (دی نیو ورلڈ آف اسلام: صفحہ) اور Hughes

(ڈکشنری آف اسلام: صفحہ ۶۶۰) وغیرہ نے قبۃ الرسول کے انہدام کا ذکر کیا ہے جو یکسر غلط ہے

(تفصیل غلط بیانیوں کے باب میں)۔

[3] اواخر ۱۲۲۰ھ/جنوری یا فروری ۱۸۰۶ء۔

[4] عنوان المجد: ۱/ ۱۳۳-۱۳۴؛ یہ قحط سالی ذی الحجہ ۱۲۱۹ھ سے ذی قعدہ ۱۲۲۰ھ تک رہی (خلاصۃ الکلام: صفحہ ۲۸۵) نجد و یمن پر بھی اس قحط کا اثر پڑا، لیکن سب سے زیادہ تنگی مکہ مکرمہ میں محسوس ہوئی۔ جنگ اور محاصرہ کی وجہ سے باشندے یوں ہی چور تھے، قحط نے بالکل

دو یورپی محقق (برک ہارٹ اور براج) جو ان واقعات کے تقریباً عینی شاہد ہیں، ان سب سے الگ واقعہ کی نئی صورت پیش کرتے ہیں:۔

"مدینہ منورہ ۱۸۰۴ء میں فتح ہوا۔ وہاں ایک شخص حسن قلعی شہر پر قابض ہو گیا تھا اور شہر کو سعود کے سپرد کرنے سے پہلے، قبہ شریف کے خزانے پر قبضہ کر کے اس نے اپنے خاص لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ فتح کے کچھ ہی بعد سعود مدینہ پہنچا اور قبہ کھول کر، جو تھوڑا بہت بچ گیا تھا، اپنے قبضے میں کر لیا۔"[۱]

سعود کا تیسرا حج
۱۲۲۱ھ
۱۸۰۷ء

سعود کے دو حج[۲] پہلے مذکور ہو چکے ہیں۔ اب دوبارہ فتحِ مکہ کے بعد پھر اسے زیارت بیت اللہ اور اپنی تبلیغی کوششوں کی تکمیل کا موقع ملا۔

تیسرے حج کا ارادہ کر کے وہ ۱۲/ ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ (۲۱ جنوری ۱۸۰۷ء) کو درعیہ سے روانہ ہوا، مکہ مکرمہ پہنچ کر اس نے اپنی حیثیت اور منصب کے مطابق صدقات وعطیات تقسیم کئے۔ ذی الحجہ کے آخر میں مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ اور وہاں انتظامی امور ٹھیک کر کے لوٹ گیا۔ احمد دحلان حجرہ شریفہ کے زر و جواہر کے نکالنے کا ذکر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸) ادھموا کر دیا۔ قلبی نے فتح مکہ کے ساتھ سلب ونہب کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ احمد زینی دحلان نے حسب عادت "وہابیوں" کو بے شمار گالیاں دی ہیں، لیکن اس "قتل ونہب" کا بالکل ذکر نہیں کیا (خلاصۃ الکلام: ص۲۹۲)۔

[۱] برک ہارٹ: ۲، ۹-۱۹۸؛ براج: ص۳۳-۳۴۔

[۲] ۱۲۱۴ھ اور ۱۲۱۵ھ۔

کرتا ہے[1]، لیکن ابن بشر ساکت ہے۔ بلنٹ[2] اور دوسرے یوروپی مورخ بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ابن بشر کے سکوت کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر نجف کی طرح حجرہ نبویہ کے زر و جواہر بھی سعود تصرف میں لاتا' یا سپاہیوں میں تقسیم کرتا' تو یہ نجدی معاصر ضرور ذکر کرتا۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک یہ کوئی مذموم فعل تھا ہی نہیں نجف و کربلا میں اس قسم کے واقعات' خود ابن بشر کی زبانی گزر چکے ہیں۔

البتہ جبرتی[3] خود عبداللہ بن سعود کی زبانی' زر و جواہر کے لینے اور پھر ان کی واپسی کا ذکر کرتا ہے، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ واقعہ صحیح ہو اور ابن بشر نے نظر انداز کر دیا ہو۔

اس سفر میں چند خاص باتیں ہوئیں۔ شامی قافلے کو شرطوں (باجے گاجے سے پرہیز وغیرہ) کی عدم تعمیل کے باعث واپس ہونا پڑا[4]۔ سعود نے ترک فوجوں کو مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور غالب نے سعود کے ہاتھ پر بیعت کی[5]۔ اس حج میں سعود کے ساتھ اس کے تمام امراء اور اہل نجد و نواح نجد کی بڑی تعداد ساتھ تھی۔

حج اور اصلاحات: ۱۲۲۲ھ۔ ۱۲۲۷ھ

۱۲۲۱ھ/۱۸۰۷ء میں تیسرا حج ہوا' اور اس کے بعد ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء تک اس نے ہر سال حج کئے۔ حج و اجتماع کے ان موقعوں پر وہ اپنی تبلیغی کوششوں سے کبھی غافل نہیں رہا۔ مختلف سالوں میں اس نے مختلف احکام نافذ کئے۔ مصری اور شامی محمل روک دئے گئے۔ نیز قافلوں کے ساتھ باجے گاجے

---

[1] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۴ - [2] A Pilgrimage to Nejd ۲، ۲۵۶

[3] عجائب الآثار: ۴، ۲۹۹ - [4] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۴ -

[5] عنوان: ۱، ۱۳۸ -

کی یک لخت ممانعت کردی۔[1]

"مکہ مکرمہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بول بالا ہوا۔ بازاروں میں اب تمباکو پینے والا نظر نہیں آتا۔ سعود نے خاص طور پر نماز کے لئے محتسب مقرر کئے۔ اذان ہوتے ہی بازاروں میں "الصلوٰۃ الصلوٰۃ" کی منادی ہوتی۔"[2]

۱۲۲۵ھ/۱۸۱۱ء میں خود ابن بشر زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوا، وہ اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتا ہے:

"میں نے بھی اس سال حج کیا۔ میں نے سعود کو احرام کی حالت میں ایک سواری (اونٹ) پر دیکھا۔ اس سواری پر کھڑے ہو کر اس نے ایک بلیغ خطبہ دیا، جس میں لوگوں کو نصیحت کی اور آداب حج بتائے اور انہیں کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی برکتیں (اتحاد، امن، دولت کی فراوانی اور سرکشوں کی اطاعت) یاد دلائیں۔ اس نے کہا کہ وہ ایک کمزور سے کمزور کو، قوی سے قوی کے مقابلہ میں اس کا حق دلا کر رہے گا۔ اسی سواری پر سے اس نے منادی کی:

مکہ مکرمہ میں کوئی ہتھیار نہ اٹھائے اور کوئی عورت آراستہ و پیراستہ ہو کر نہ نکلے۔ اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دی اور بازاروں میں نماز پر آمادہ کرنے کے لئے خاص آدمی مقرر کئے۔ اب تم نماز کے وقت شاید ہی کسی کو برگشتہ پا سکو۔ اور ان تمام سالوں میں، بازار میں کوئی تمباکو یا دوسری مسکرات کھلم کھلا استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔"[3]

---

[1] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۲۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۹ء؛ عنوان: ۱/ ۱۴۱۔

[3] عنوان: ۱/ ۱۸۱۔

۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۲ء کے متعلق ابن بشر لکھتا ہے:-

"اور مکہ مکرمہ میں اب کوئی منکر چیز (تمباکو نوشی، ترک صلوٰۃ اور غیر اللہ کی قسم کھانا) نہیں دکھائی پڑتی۔

سعود بن عبد العزیز کی اصلاحات کا سب سے زیادہ مفصل ذکر جبرتی کرتا ہے۔ محرم ۱۲۲۱ھ کے حوادث میں شریف غالب اور امیر سعود کی باہمی مصالحت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"... منکرات کی گرم بازاری اس نے قطعاً روک دی۔ اسی طرح مسعی اور صفا و مروہ کے درمیان تمباکو نوشی بھی بند کر دی۔ جماعت کے ساتھ نمازوں کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائگی کا حکم دیا۔ ریشمی کپڑوں کے استعمال کی بھی ممانعت کی۔ ناروا محصول اور عام مظالم روک دیے گئے اور وہ لوگ (اہل مکہ اور شریف مکہ) اس بارے میں حد سے گزر چکے تھے۔ اور تو اور وہ ہر لاش پر پانچ یا دس فرنک ٹیکس لیتے تھے، اور اگر مردے کے اعزا مقررہ محصول نہ ادا کر سکتے، تو انھیں لاش اٹھانے اور دفن کرنے کی اجازت نہ ملتی۔ ... اس کے علاوہ بے شمار بدعتیں اور نت نئے ناروا محصول انھوں نے ایجاد کر لئے تھے۔ بازار کی خریداری اور گھروں پر بھی محصول عائد ہوتا۔ بسا اوقات انسان اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھا ہوتا، اور اسے یک بیک گھر خالی کرنے کا حکم ملتا۔ سرکاری ملازم کہتے کہ "آقا کو اس گھر کی ضرورت ہے، اب یا تو گھر خالی کر دو یا پھر کچھ لے دے کر مصالحت کر لو"۔ ....

"... شریف نے ان سب چیزوں کے ترک کر دینے کا عہد کیا اور جیسا کہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حکم دیا ہے، توحید، اتباع رسول اور خلفائے راشدین کے اُسوۂ کی پیروی کا عہد کیا۔ اور ان تمام چیزوں سے احتراز کا وعدہ کیا، جو لوگوں نے بعد کو پیدا کر لی ہیں۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا، قبروں پر قبوں کی تعمیر، تصویروں اور نمائشی چیزوں کی بہتات، چوکھٹوں کو بوسہ دینا، غیر اللہ کے لئے تذلل اور خضوع ــــ خلاصہ یہ کہ ان تمام بدعتوں سے اجتناب کا اس نے عہد کیا جن میں کہ مخلوق کو کسی نہ کسی طرح الوہیت کا شریک گردانا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ ان اصلاحات کے بعد راستے مامون ہو گئے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور جدہ اور طائف کے راستے کھل گئے[1] ۔۔۔۔۔۔"

برک ہارٹ[2] نے بھی نمازوں پر سختی اور سزاؤں کا ذکر کیا ہے،

بعض دوسری فتوحات اور لڑائیاں حجاز کی فتح پر سعود کی فوجی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں۔ (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) میں اس نے نجف پر حملہ کیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی[3]۔ راستے میں سماوہ اور زبیر پر حملے کئے گئے۔

ربیع الآخر ۱۲۲۵ھ (جون ۱۸۱۰ء) میں سعود نے شام کا قصد کیا اور متعدد حملوں کے بعد کافی مال و متاع لے کر کامیاب لوٹا[4]۔ اور ابن بشر کے بیان کے مطابق:

"اس غزوہ کی وجہ سے اہل شام کے دلوں پر سعود کی دھاک بیٹھ گئی۔"

بصرہ اور اس کے نواح پر بار بار حملے ہوئے، لیکن کوئی پائدار فائدہ نہیں ہوا۔

---

[1] عجائب الآثار: ۴، ۶-۵ (ملخص)۔ [2] صفحہ ۱۴۷۔

[3] عنوان: ۱، ۳۵۔

[4] عنوان: ۱، ۱۴۹-۱۴۸۔

راس الخیمہ: ۱۲۲۴ھ

ان لڑائیوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ایک جھڑپ ہوئی۔ خلیج فارس کے باشندے، جو قبیلہ جوازم سے تعلق رکھتے تھے، عرصہ سے تجارتی جہازوں پر دھاوے کیا کرتے اور کامیاب رہتے۔ اب سالہا سال سے عمان اور خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر سعود کا سکہ چلتا تھا، اور یہ بحری سپاہی (قرصان Pirates) بھی سعود ہی کے زیر نگیں تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس "بحری تاخت" کے روک تھام کی انگریزوں نے بڑی کوششیں کیں اور آخر حکومت بمبئی نے ستمبر ۱۸۰۹ء (رمضان ۱۲۲۴ھ) میں، ان کے مرکز راس الخیمہ پر سخت حملہ کیا، اور قرصان Pirates کے بیڑہ کو کاری ضرب لگائی۔[۱] ۱۲ نومبر ۱۸۰۹ء (شوال ۱۲۲۴ھ) تک راس الخیمہ جلا کر راکھ کیا جا چکا تھا۔ اور قرصان کو اپنا راس الخیمہ کا مرکز چھوڑنا پڑا۔

گو اس شکست سے نجدیوں کی مقامی ساکھ قائم رہی، اور عمان کے اندرونی علاقوں میں ان کی عسکری تگ و تاز جاری رہی۔ پھر بھی زویمر کے الفاظ میں:

"مصریوں سے پہلے اہل نجد کو جو سب سے سخت دھکا لگا، وہ یہی برطانیہ کے ہاتھوں تھا۔ ۱۸۰۹ء میں بمبئی سے الگ ایک انگریزی مہم ان کے خاص بحری مستقر اور مرکز راس الخیمہ کے "قرصنی باشندوں (Piratic inhabitants) کے خلاف پہنچی۔ مرکز پر بمباری کی گئی اور جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔[۲] براکج[۳] نے وہابیوں کی زیادتیوں، اور راس الخیمہ پر حملہ اور پھر ان کی سزایابی کی مفصل

۱؎ عنوان: ۱/ ۱۴۶ : فلبی ص ۹۲

۲؎ Arabia : The Cradle of Islam

۳؎ براکج: ص ۴۴-۳۵ ؛ نیز برک ہارٹ : ص ۲۰۸

روداد بیان کی ہے۔ اور کرنل اسمتھ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "وہابی کی طاقت پر یہ پہلی اخلاقی ضرب تھی"۔

مصریوں کا حملہ

۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء

اواخر ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں مصریوں کا حملہ شروع ہوا۔ اس وقت نجدی حکومت کا اثر شمال میں حلب سے لے کر بحر ہند تک اور مشرق میں خلیج فارس اور عراق سے لے کر بحر قلزم تک پھیلا ہوا تھا۔ اور راس الخیمہ کی زک کو چھوڑ کر اب تک اس جواں سال حکومت کو کوئی قابل ذکر صدمہ بھی نہیں پہنچا تھا۔

نجدی اثر و اقتدار کی خبریں آستانہ پہنچ رہی تھیں۔ بغداد، دمشق اور جدہ کے حاکم عاجز آچکے تھے۔ آخر باب عالی نے تنگ آکر محمد علی پاشا خدیو مصر کو اہل نجد کی سرکوبی پر مامور کیا۔[۱] کہا جاتا ہے کہ یہ ۱۸۰۵ء میں اسی شرط پر مصر کا پاشا بنایا گیا تھا "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے"۔ شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ محمد علی[۲] خدیو مصر کی روز افزوں طاقت بھی باب عالی کے لئے مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ آل سعود اور خدیو مصر دونوں کی ٹکر آستانہ کے عرش نشینوں کے لئے بہر حال فائدے سے خالی نہیں تھی۔

محمد علی کا بیٹا طوسون (ف ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء) دس ہزار فوج لے کر ساحل پر اترا اور باسانی ینبع پر قابض ہو گیا۔[۳] اس کے بعد وہ مدینہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں جدیدہ

---

[۱] ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء۔ [۲] محمد علی پاشا، مصر کے موجودہ شاہی خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ غالباً یہ البانوی نسل کا تھا۔ گو اس کے جانشین ابراہیم پاشا کا یہ قول مشہور ہے، کہ "عربی زبان و تمدن نے ہمیں 'عرب' بنا دیا"۔ محمد علی کی ولادت ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں اور وفات ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں ہوئی۔ [۳] ۱۸۱۱ء / ۱۲۲۶ھ

کی تنگ گزرگاہ کے قریب سعود کے بیٹوں، عبداللہ اور فیصل نے جم کر مقابلہ کیا اور شکست دی۔ تقریباً بارہ سو مصری مقتول ہوئے[۱]۔ اور طوسون کو پھر ینبع کی طرف ہٹنا پڑا[۲]۔

طوسون | طوسون کچھ دنوں ینبع پڑا رہا، پھر اس نے مدینہ کی طرف پیش قدمی کی اور ابکی دو ماہ کے محاصرے کے بعد مصری مدینہ منورہ پر قابض ہو گئے[۳]۔

طوسون فوراً جدہ پہنچا۔ عبداللہ بن سعود، جو حجاز میں نجدی افواج کا سردار تھا، مکہ مکرمہ خالی کرنے پر مجبور ہوا۔ اور بلد الحرام پر بلا کسی پس و پیش کے مصریوں کا قبضہ ہو گیا[۴]۔ کچھ ہی دنوں کے بعد طائف بھی ان کے قبضہ واقتدار میں آگیا۔ اور احمد دحلان کے بیان کے مطابق اس فتح کی خوشی میں تمام مصری قلمرو میں پانچ روز جشن منایا گیا۔ اس کے بعد طائف سے قریب تربہ کے قریب سخت معرکہ پیش آیا اور مصریوں کو شکست ہوئی[۶]۔

تربہ کے اس واقعہ کے بعد سعود کے گورنر عثمان مضایفی کی ہمت بڑھی۔ اور پھر

---

[۱] برک ہارٹ: ص۲۳۲ - [۲] اواخر ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ/دسمبر ۱۸۱۱ء؛ ماردتمان نے مصریوں کی شکست کی تاریخ، رذی قعدہ ۱۲۲۶ھ (۲۳ نومبر ۱۸۱۱ء) دی ہے۔ برک ہارٹ (ص۲۲۹) اور براج (ص۵۱) نے پیش قدمی کی تاریخ جنوری ۱۸۱۲ء لکھی ہے۔

[۳] ذی قعدہ ۱۲۲۷ھ/نومبر ۱۸۱۲ء؛ عنوان: ۱۵۸/۱؛ فلبی: ص۹۴۔

[۴] محرم ۱۲۲۸ھ/جنوری ۱۸۱۳ء؛ عنوان: ص۱۶

[۵] خلاصۃ الکلام: صفحہ ۲۹۶۔

[۶] شعبان ۱۲۲۸ھ/اگست ۱۸۱۳ء؛ عنوان: صفحہ ۱۶۱۔

اس نے طائف کی طرف پیش قدمی کی لیکن اسے ایسی زک ہوئی - اس کے بہت سے آدمی کام آئے اور آخر وہ خود گرفتار ہوا[۵۱] - اور غالب نے اسے محمد علی پاشا کی خدمت میں مصر بھیج دیا۔ محمد علی، تو حجاز کے لئے رخت سفر باندھ چکا تھا، اس کی عدم موجودگی میں عثمان مضایفی کو ایک خچر پر بٹھا کر پورے قاہرہ میں گشت کرایا گیا، اور اس کے بعد دار الحکومت (آستانہ) بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی[۵۲] - احمد دحلان جس نے عثمان مضایفی کی برائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی[۵۳] - اس بے رحمانہ قتل پر اظہار افسوس کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"عثمان مضایفی جب مصر میں تھا، تو محمد علی پاشا کے ارباب حکومت اس کی گفتگو اور فصیح زبان سے بہت متاثر ہوئے - اس کی متانت اور وقار کا ان پر بڑا اثر ہوا - اس کے چہرہ سے امارت، اور شرافت کے آثار ظاہر تھے .....
یہاں تک کہ اکثر لوگ ایسے شریف آدمی کو آستانہ بھیجنے پر اظہار افسوس کرنے لگے وہ جانتے تھے کہ دار السلطنت پہنچ کر اس کا بچنا ناممکن ہے[۵۴]۔ الخ"

---

۵۱ - ۱۰ رمضان ۱۲۲۸ھ / ۶ اگست ۱۸۱۳ء؛ عنوان: ص ۱۶۲؛ فلبی (ص ۹۶) نے عثمان مضایفی کی گرفتاری اور قتل کے واقعہ کو مؤخر کر دیا ہے، احمد دحلان (۲۹۶) اور ابن بشر (۱۶۲) دونوں اس واقعہ کو محمد علی پاشا کی آمد حجاز سے پہلے ذکر کرتے ہیں - برک ہارٹ (ص ۲۴۷) اور برائج (ص ۶۱) کا بیان ہے کہ عثمان مضایفی کی گرفتاری پر پانچ ہزار ڈالر انعام رکھا گیا تھا یہ دونوں گرفتاری کی تاریخ ستمبر ۱۸۱۲ء بتاتے ہیں، اور معرکۂ بسل کے بعد جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔

۵۲ - اواخر ۱۲۲۸ھ / دسمبر ۱۸۱۳ء۔ ۵۳ - خلاصۃ الکلام: ص ۲۷۱-۲۷۲۔

۵۴ - ایضاً: ص ۲۹۶ ملخص۔

جنگ اور فتح کی رفتار سے غیر مطمئن ہو کر خود محمد علی حجاز کے قصد سے روانہ ہو گیا[1] اور اواخر شوال میں اس نے جدہ میں قدم رکھا۔ اس نے آتے ہی پہلے شریف غالب کی امارت کا خاتمہ کیا[2] اور اسے گرفتار کر کے مصر، اور وہاں سے سلونیکا بھیج دیا گیا، جہاں غریب دو سال کے بعد دارِ آخرت کو سدھار گیا[3]۔ غالب کے بھتیجے یحییٰ بن سرور کو برائے نام امیر بنایا گیا اور تمام ملکی اختیارات، حجاز کے نئے گورنر احمد پاشا کو دیدے گئے۔ حجاز کو بدنام وہابیوں کے پنجہ سے نکال کر مصر کا ایک صوبہ بنا دیا گیا[4]۔

اسی امارت کے پیچھے غالب نے کیا نہ کیا؟

"وہ کبھی وہابیوں کے ساتھ چاپلوسی سے پیش آتا، اور ان کے عقائد کی تائید کرتا، کبھی قبوں کے گرانے کا حکم دیتا، کبھی مؤذنوں کو سلام (بعد الاذان) سے

---

[1] شوال ۱۲۲۸ھ / ۱۰ر اکتوبر ۱۸۱۳ء: خلاصۃ: ص ۲۹۶

[2] فلبی (ص ۶۵) نے ورودِ جدہ کی تاریخ ۲۸ر اگست ۱۸۱۳ء دی ہے۔ اسی طرح مارد تمان نے اواخر اگست لکھا ہے۔ ابن بشر نے (ص ۱۶۳) قدوم مکہ مکرمہ کی تاریخ صرف ذی قعدہ دی ہے۔ برک ہارٹ (ص ۲۸۱) اور برائج (ص ۶۳) ستمبر ۱۸۱۳ء لکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں خلاصۃ الکلام پر اعتماد کیا ہے۔ فلبی کی تاریخ واقعات کی ترتیب سے لاگ نہیں کھاتی۔

[3] اواخر رمضان ۱۲۳۱ھ / جولائی ۱۸۱۶ء، عنوان: ص ۱۸۵؛ الرحلۃ الحجازیۃ، ص ۹۰؛ برک ہارٹ، ص ۲۶۲

[4] حجاز اس کے بعد ایک عرصہ تک مصر کے تابع رہا۔ اسی دوران میں محمد علی اور بابِ عالی کے درمیان اَن بن ہوئی اور خونریز معرکے ہوئے۔ محمد علی کا بیٹا شام پر بھی قابض ہو گیا۔ اس کے بعد جب سلطان عبدالمجید تخت نشین ہوا (۱۲۵۵ھ) تو حجاز براہ راست دولت علیہ کی حمایت میں آیا (خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۸)

روکتا ہے[1]

یہ سب اس لئے کہ سعود کہیں اسے معزول نہ کردے[2]۔ سعود کا مقصد نیک تھا، اس نے غالب کی امارت قائم رکھی۔ محمد علی، خالص دنیادار تھا، اس نے قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اسی غریب کا خاتمہ کیا۔ محمد علی نے جس عیاری کے ساتھ غالب کو گرفتار کیا ہے، اس کا حال خلاصۃ الکلام میں پڑھیے[3]۔

برآئج نے بھی غالب کی گرفتاری کی تفصیلات دی ہیں، جو خلاصۃ الکلام سے ملتی جلتی ہیں۔ غالب اور محمد علی کے باہمی نزاع پر بھی اس نے کافی روشنی ڈالی ہے[4]۔ غالب اور محمد علی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے موقعہ پر وہ لکھتا ہے:

"یہ تو امید ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ محمد علی اور غالب جیسے پرلے درجہ کے پختہ مکار So accomplished in deceit ایک دوسرے پر اعتماد کرسکیں گے"[6]

برکھارٹ نے بھی محمد علی کی بدنیتی اور مکاری کی بار بار اور سخت شکایت کی ہے[7]، لیکن وہ غالب کا مداح ہے، جب غالب قید ہو کر مصر پہنچا تو برکھارٹ وہاں موجود تھا اور اس نے غالب کی ملاقات کے تاثرات قلم بند کئے ہیں[8]۔

---

[1] الرحلۃ الحجازیۃ: ص ۸۹ [2] خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۲۔

[3] اس عیاری کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی نے دعوت کے بہانے سے گورنر ہاؤس میں بلایا۔ اس کے آدمی چھپے ہوئے تھے۔ بیچارے کو تنہا اور بے مددگار پاکر گرفتار کرلیا۔ بزدل حجازی سرپیٹ کررہ گئے۔ [4] ص ۶۹-۶۸۔ [5] ص ۶۹-۶۱، [6] ص ۴۷،

[7] ص ۲۴۲، [8] ص ۲۶۲-۲۵۹،

لیکن ابھی محمد علی اور مصریوں کی حالت کوئی ایسی قابل اطمینان بھی نہیں تھی۔ حجاز، عسیر اور یمن کے ساحلی مقامات تو آسانی سے مصریوں کے قبضہ میں آ گئے، لیکن اندرونی علاقے ابھی تک نجدیوں کے زیر اثر تھے۔

مصطفی بے مقابلہ کے لئے بھیجا گیا، ترَبہ کے مقام پر پھر جنگ ہوئی، اور مصریوں کو شکست اُٹھانا پڑی[۱]۔ عجیب بات یہ ہے کہ نجدیوں نے یہ معرکہ ایک بہادر عورت غالیہ کی سرکردگی میں سر کیا تھا[۲]۔ برک ہارٹ نے غالیہ کی بہادری کی توصیف میں زبان قلم کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔

محرم ۱۲۲۹ھ (جنوری ۱۸۱۴ء) میں سمندر سے مصری کمک پہنچی اور قنفذہ کے قریب فریقین میں مڈبھیڑ ہوئی اور مصریوں کو شکست ہوئی[۳]۔

سعود کی وفات: ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء
ابھی نجدیوں اور مصریوں کی کشمکش اس خطرناک مرحلہ سے گزر رہی تھی اور نجدی پھر از سر نو مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے کہ برات کا دولھا ہی چل بسا۔ امیر سعود بن عبد العزیز بن محمد بن سعود نے دوشنبہ ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۹ھ[۴] (پہلی مئی ۱۸۱۴ء) کی شب کو دار آخرت کی راہ لی۔ اور محمد علی پاشا کی مہم کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اب نجد کی نئی حکومت کے پھولنے پھلنے کی توقع سرد ست جاتی رہی۔

۱؎ اواخر ذی الحجہ ۱۲۲۸ھ / دسمبر ۱۸۱۳ء :- عنوان: ص ۱۶۲-۱۶۳

۲؎ برک ہارٹ: ص ۹-۲۶۸؛ فلبی: ص ۹۶؛ دحلان: ص ۳۰ ۳؎ عنوان: ص ۱۶۴۔

۴؎ عنوان المجد: ص ۱۷۶؛ مارد تمان ۸ رجمادی الاولیٰ (۲۷ راپریل ۱۸۱۴ء) تاریخ وفات بتاتا ہے، جسے صحیح ماننے میں ہمیں تامل ہے۔

سیرتِ سعود ان لڑائیوں سے الگ بھی سعود ایک بے مثال امیر اور فرماں روا تھا

اس کی پیدائش سنہ ۱۱۶۰ھ یا سنہ ۱۱۶۳ھ میں ہوئی[1]۔ شیخ الاسلام جیسا استاذ اور مربی ملا

پھر کیا تھا، علم و عمل کا نمونہ بن کر نکلا۔ شیخ الاسلام کے درس میں مسلسل کئی سال تک

سعود نے حاضری دی اور حدیث و فقہ میں اچھی دستگاہ حاصل کی۔ اس کے خطبے اور

مکتوبات زبان اور علم دونوں کی حلاوت رکھتے ہیں۔

لڑائیوں میں عام طور پر نماز مغرب کے بعد وعظ کہتا اور لوگوں کو صبر و طاعت کی تلقین کرتا۔ نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام (رض) کا اسوہ پیش کر کے انھیں بہادری اور ثابت قدمی پر آمادہ کیا کرتا۔

جنگوں میں انتہائی مخاصمت اور شدت کے باوجود بچوں، عورتوں، بوڑھوں پر ہاتھ نہیں اُٹھایا جاتا، البتہ مال غنیمت میں رعایت نہیں ہوتی۔ لڑائی ختم ہوتے ہی "خمس" وضع کر کے مال غنیمت سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ سپاہیوں میں بھی پیادہ اور سوار کا فرق قائم رکھا جاتا۔ راجل (پیادہ) کو فارس (سوار) کا نصف ملتا۔ خلاصہ یہ کہ جنگوں میں یکسر ٹھیٹھ اسلامی قانون پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

یہ تو رزم کا حال تھا، بزم کی کیفیت کچھ اور ہوتی۔ اہل درعیہ نماز صبح کے بعد روزانہ کسی عام جگہ (قصر سے باہر) جمع ہوتے۔ امیر سعود اور آل سعود صدر نشین ہوتے۔ ان کے پہلو بہ پہلو شیخ الاسلام کے اہل خاندان ہوتے، جن کا کوئی فرد درس و وعظ کی خدمت انجام دیتا۔ صبح کی مجلس میں عام طور پر عبداللہ بن شیخ الاسلام درس دیتے۔ اکثر تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کا سبق ہوتا۔ درس سے فارغ

---

[1] البدر الطالع: ۱، ۲۶۳۔

ہو کر وہ قصر میں جلوہ افروز ہوتا، اور عام مخلوق کی ضروریات سنتا اور ان کی شکایات دور کرتا۔ درمیان میں قیلولہ کا وقفہ ہوتا اور ظہر کے بعد قصر کے اندر درس کی مجلس مرتب ہوتی، لیکن اس وقت آل الشیخ نہ ہوتے، ظہر کے بعد ان میں سے ہر ایک کا حلقہ درس الگ الگ جمتا۔ اس سہ پہر کے درس میں خود امیر سعود معلم کی حیثیت سے داد علم دیتا۔ عام طور پر تفسیر ابن کثیر اور ریاض الصالحین کی قراءت ہوتی اور سعود تقریر و شرح کرتا۔ درس سے فارغ ہو کر پھر دو گھنٹے رعایا کی شکایات و ضروریات کے سننے اور ان کی تعمیل میں مصروف رہتا۔ یہ سلسلہ عصر تک جاری رہتا۔

نماز مغرب کے بعد پھر قصر میں اجتماع ہوتا، اعیان و عوام سب حاضر ہوتے، عام مجلس ہوتی۔ امیر سعود بھی حاضر ہوتا، شیخ سلیمان بن عبد اللہ بن شیخ الاسلام (مقتول ۱۲۳۳ھ) صحیح بخاری کا درس دیتے۔ ابن بشر (جو ان مجلسوں میں حاضر ہوتا رہا ہے) الشیخ سلیمان بن عبد اللہ کی وسعتِ نظر کا غیر معمولی طور پر مداح ہے۔

یہ امیر سعود بن عبد العزیز کی اجمالی سیرت تھی تفصیل کے لئے عنوان المجد[51] کا مطالعہ کافی ہوگا۔

سعود کے تدبّر اور جنگی صلاحیتوں کا برائج[52] بھی خاص طور پر ذکر کرتا ہے برک ہارٹ[53] نے اس کا خاص وصف یہ بتایا ہے:

"کہ وہ حملوں میں رازداری اور اخفاء کا بہت خیال رکھتا تھا۔ حوران (شام) پہنچنے میں اسے ۳۵ دن لگے، لیکن اس کے حملے کی خبر صرف دو دن پہلے پہنچ سکی۔"

---

[51] ۱، ۱۷۶-۱۶۵ - [52] صفحہ ۸۰ - [53] صفحہ ۱۷۰ -

عبدالعزیز بن سعود اور خاص کر سعود بن عبدالعزیز کے عہد میں امن و امان کا ذکر کرتے ہوئے برک ہارٹ کہتا ہے[1] :-

"غالباً پیغمبر عرب کے بعد پہلی بار ملک میں ایسا امن و امان قائم ہوا کہ بدوؤں کو اپنے مال و متاع اور مویشیوں کی طرف سے بے فکر ہو کر آرام سے سونے کا موقع ملا ...... الخ الخ

اسی طرح رُعب کا یہ عالم تھا :-

"کہ ایک معمولی حبشی غلام بڑے سے بڑے قبیلے کے سردار کو یکہ و تنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا"[2]

عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز
۱۲۲۹ھ - ۱۲۳۳ھ
۱۸۱۴ء - ۱۸۱۸ء

سعود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا عبداللہ جانشین ہوا۔ یہ بہادری میں اپنے باپ سے کم نہیں تھا، لیکن حزم و سیاست میں بہت پیچھے تھا۔ اپنے کو خطرات میں گھرا ہوا پا کر اس نے حریف سے صلح کرنا چاہی۔ اس حریف سے جو نجد کے ملیا میٹ کر دینے کی قسم کھا چکا تھا وہ صلح کیوں کرتا، اور جب اس نے صلح بھی کی، تو عہد پر قائم نہ رہ سکا۔

آئیے، اب ہم میدان جنگ کی طرف پھر متوجہ ہوں۔ بحر احمر کے ساحل پر قنفذہ ان کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ اب محمد علی نے عابدین بک کو ایک بڑی فوج دے کر زہران (یمن) کی طرف بھیجا۔ راستہ میں قنفذہ پر مصریوں نے قبضہ کر لیا۔ نجدیوں کو خبر ملی، تو پھر انھوں نے قنفذہ کو دوبارہ اپنے قبضہ میں کر لیا[3]۔ زہران (یمن) والی مہم میں بھی مصریوں کو

---

[1] ص ۱۳۷ [2] ص ۵۲ ،، ص ۱۳۹

[3] جمادی الاولیٰ ۱۲۲۹ھ / مئی ۱۸۱۴ء۔

زک ہوئی۔[1] زہران کی شکست سے فیصل بن سعود کی ہمت بڑھی۔ وہ ابھی تک طائف کے قریب ڈٹا ہوا تھا۔ اب اس نے طائف پر حملہ کی ٹھانی، اور طوسون بن محمد علی کی حالت پریشان کن ہو چلی تھی کہ محمد علی کمک لے کر آگیا اور فیصل کو پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ طائف کے قریب بسل میں سخت معرکہ ہوا اور مصریوں کی فتح ہوئی۔[2]

"اس بسل کے معرکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ وہابی کام آئے۔ ایک سر کی قیمت چھ ڈالر رکھی گئی تھی۔ محمد علی کے سامنے لاشوں کا ڈھیر لگ گیا۔"[3]

"اسی معرکہ کے بعد سے وہابیوں کی قوت کمزور ہوئی۔ انہوں نے غلطی یہ کی کہ پہاڑیوں سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے۔ سعود کی وصیت تھی کہ مصریوں اور ترکوں سے کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہ کیا جائے۔"[4]

معرکۂ بسل کے بعد محمد علی نے جو مظالم ڈھائے، اس کی داستان انتہائی لرزہ خیز ہے۔ برک ہارٹ جو ان واقعات کا عینی شاہد ہے، ان مظالم کی انتہائی مذمت کرتا ہے۔ ایک معمولی واقعہ یہ ہے کہ مقتول وہابی سپاہیوں کی لاشیں کتوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھیں۔[5] محمد علی نے بڑھ کر تربہ پر بھی قبضہ کر لیا۔[6]

---

[1] شوال ۱۲۲۹ھ۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۸۱۴ء [2] آغاز ۱۲۳۰ھ اواخر ۱۸۱۴ء [3] برک ہارٹ: ص ۳۱۷-۳۱۸ [4] ایضاً: ص ۳۲۳؛ نیز برائج: ص ۹۲۔ [5] ۳ صفر ۱۲۳۰ھ ۱۵ جنوری ۱۸۱۵ء

[6] یہ ہارڈمان کا بیان ہے۔ ابن بشر نے تاریخ کی تعیین نہیں کی۔ جبرتی (۴: ۲۱۸) کے فتح تربہ کی خبر مصر ۹ ربیع الاول ۱۲۳۰ھ کو پہنچی۔ برک ہارٹ نے مکہ مکرمہ سے محمد علی کی روانگی کی تاریخ ۲۶ محرم ۱۲۳۰ھ (۷ جنوری ۱۸۱۵ء) بتائی ہے۔

تربہ کے بعد آس پاس کے قبائل کو مطیع کرتا ہوا وہ عسیر تک پہنچ گیا اور وہاں سے قنفذہ ہو کر مکہ مکرمہ واپس ہوا۔ پھر ایک فوری ضرورت کی بنا پر اسے مصر جانا پڑا[لے]۔ ابھی محمد علی، عسیر کی مہم سے فارغ ہو کر تہامہ پہنچا بھی نہ ہوگا کہ اس کا بیٹا مدینہ منورہ میں نجد پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ بڑھ کر وہ قصیم کے بعض مشہور مقامات (رس وغیرہ) پر قابض ہو گیا۔ لیکن مدینہ کے ساتھ رسل و رسائل کا تعلق نجدی جتھوں کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ اور پھر اُسے اپنے باپ کی خبر نہ مل سکی، جو حقیقت میں اس وقت تک مصر کے لئے رختِ سفر باندھ چکا تھا۔ محمد علی جہاز سے جیزہ (مصر) ۱۵ رجب ۱۲۳۰ھ ۲۳ جون ۱۸۱۵ء[ئے] کو پہنچا۔ ادھر عبداللہ بن سعود نے اُسے گھیر لیا، اور مصری کوئی دو مہینے اسی حال میں پڑے رہے۔ مجبوراً صلح کی سلسلہ جنبانی کرنا پڑی۔

صلح اور فریب "اور فریقین کے درمیان صلح ہو گئی۔ طوسون اور عبداللہ دونو[ں] لڑائی ختم کرنے پر متفق ہو گئے۔ (یہ بھی طے ہوا) کہ ترک (یعنی مصری) نجد اور اس کے علاقوں سے اپنا قبضہ اُٹھا لیں گے۔ ترکی، شام، مصر سے نجد آنے اور جانے والوں کے لئے پورا امن ہوگا۔ اور سب کے لئے حج کی آزادی ہو گی، اور سبھوں نے شرط نامے (رسجل) لکھ دیئے۔

"اور ترک (مصری) رس سے پہلی شعبان کو ۱۲۳۰ھ / ۹ جولائی ۱۸۱۵ء مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبداللہ (بن سعود) نے صلح کا خط دے کر اپنے دو آدمی (عبداللہ بن محمد بن بنیان" اور قاضی عبدالعزیز بن

[ئے] جبرتی ۴، ۲۲۰، برک ہارٹ ۲/۳۴۹، محمد علی کے قاہرہ پہنچنے کی تاریخ ۲۵ جون ۱۸۱۵ء بتاتا ہے۔

[لے] عنوان: ۱/۱۸۱۔

محمد بن ابراہیم) بھی ان کے ساتھ بھیجے، کہ وہ مصر جاکر محمد علی کے سامنے اسے پیش کریں۔ وہ لوگ مصر پہنچے اور واپس ہوئے، اور صلح مکمل ہوگئی"[۱]

کہا جاتا ہے کہ اس صلح نامہ کی رو سے عبداللہ نے سلطان (قسطنطنیہ) کی ماتحتی تسلیم کرلی تھی اور کسی قریبی موقع پر "آستانہ" خلافت پر حاضری کا وعدہ بھی کرلیا تھا[۲]۔ طوسون نے بھی جواب میں نجدی علاقہ کے خالی کرنے اور نجدیوں کو حج کی پوری آزادی دینے کا وعدہ کرلیا"[۳]

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عبداللہ کی حالت بہتر تھی اور تمام جنوبی علاقوں سے اس کے پاس کمک آرہی تھی۔ وہ نزاکت کو سمجھتا اور چاہتا تو مصریوں کی وقتی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ان کا قلع قمع کردیتا۔ لیکن اس نے صلح کرکے یہ زرین موقع کھو دیا۔ طوسون، امن و امان کے ساتھ مدینہ لوٹ گیا[۴]۔

ابن بشر اور فلبی کے مندرجہ بالا بیانات بتاتے ہیں کہ طوسون اور عبداللہ کے درمیان صلح مکمل ہوگئی تھی۔ ابن بشر تو یہاں تک کہتا ہے کہ عبداللہ کے قاصد مصر سے کامیاب واپس ہوئے[۵]

فلبی کہتا ہے کہ "محمد علی پاشا نے یہ صلح ناپسند کی اور درعیہ کی تباہی کی دھمکی دیتے ہوئے، عبداللہ سے فوراً آستانہ پہنچنے کا مطالبہ کیا"۔ عبداللہ اپنے کو

---

۱ عنوان: ص ۱۸۳۔ ۲ برک ہارٹ، ابن بشر اور جبرتی جیسے مستند اور معاصر مورخ "دار الخلافت" کی حاضری کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ بلنٹ اور فلبی وغیرہ شدومد کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔

۳ فلبی: ص ۹۷؛ بلنٹ: ۲، ۲۵۸۔ ۴ برک ہارٹ: ص ۱۳۴: اواخر جون ۱۸۱۵ء

۵ عنوان: ۱، ۱۸۳۔

ارباب حکومت کے قدموں پر ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیئے وہ اپنے مطیع قبائل کو منظم کرنے اور اپنے پایہ تخت کے استحکام میں لگا رہا[1]

عبداللہ کے قاصد مصر میں

ابن بشر اور فلبی کے علاوہ جبرتی اور دوسرے مؤرخوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ صلح کی تکمیل محمد علی کی منظوری پر موقوف تھی۔ اور اسی غرض سے عبداللہ نے دو قاصد اس کی خدمت میں بھیجے، جو طوسون اور عبداللہ کے معاہدہ کے بعد پہلی شعبان ۱۲۳۰ھ (۹ جولائی ۱۸۱۵ء) کو مدینہ ہوتے ہوئے مصر روانہ ہوگئے۔ شوال کے آغاز میں وہ مصر پہنچے[2] اور وہ پاشا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"لیکن پاشا کو یہ صلح خوش نہ آئی اور اس نے آنے والوں کی خاطر مدارات نہ کی، بلکہ ان کے ساتھ خشونت سے پیش آیا۔"[3]

اور جبرتی کے بیان کے مطابق نجدی قاصدوں نے نرمی اور عاجزی کے ساتھ گفت گو کی۔ سعود بن عبدالعزیز کی شدت اور عبداللہ بن سعود کی نرم مزاجی کا ذکر کیا۔

جبرتی ان نجدی قاصدوں (عبداللہ بن محمد بن بُنَیّان اور قاضی عبدالعزیز بن حمد بن ابراہیم کے شوقِ علم اور حسنِ اخلاق کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔
برک ہارٹ نے بھی سعود کے قاصدوں اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔
وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ علمائے مصر ان کی گفت گو و بحث سُن کر مطمئن ہوگئے[4]

---

۱ فلبی: ص ۹۷ ۲ جبرتی: ۴، ۲۲۹۔ ۳ ایضاً

۴ برک ہارٹ: ص ۱۱۳

اُس وقت کے نجدیوں کے اخلاق و علم کا اندازہ کرنے کے لئے معاصر اور عینی شاہد جبرتی کی یہ رائے سننے کے لائق ہے:-

"وہ دونوں جامع ازہر ایسے وقت گئے، جب کوئی صاحبِ تدریس وہاں موجود نہ تھا۔ انہوں نے امام احمد بن حنبل کے اہل 'مذہب' اور فقہ حنبلی کی کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ لوگ مصر میں بالکل ختم ہو گئے۔ اور ان دونوں نے تفسیر اور حدیث کی مختلف کتابیں (جیسے خازن، کشاف، بغوی، صحاح ستہ وغیرہ) خریدیں۔ میں ان دونوں سے دو مرتبہ ملا۔ میں نے ان میں اُنس، فصاحتِ زبان، وسعتِ نظر اور معلومات کی فراوانی پائی اور ان کی عاجزی، حسن خلق، ادب، تفقہ اور فقہی مسائل و اختلافات پر عبور کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک کا نام عبداللہ اور دوسرے کا عبدالعزیز ہے، اور دوسرا ہر اعتبار سے افضل ہے۔"[۲]

عبداللہ بن سعود کے قاصدوں کا حال اور محمد علی پاشا کا ان کے ساتھ برتاؤ دونوں کے متعلق آپ ایک معاصر مصری مؤرخ کی زبانی سن چکے۔ تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مختلف اسباب[۳] کے ماتحت، جن میں مؤرخوں[۴] کا اختلاف ہے، محمد علی نے صلح مسترد کر دی، طوسون کو جو ذیقعدہ تک حجاز ہی میں مقیم رہا،[۵] مصر واپس بلا لیا گیا۔ اوائل ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ (نومبر ۱۸۱۵ء) میں وہ مصر پہنچ گیا۔ اور تقریباً ایک سال کے بعد دارِ آخرت کی راہ لی۔[۶] گو انتقال سے پہلے ہی وہ

---

۲ جبرتی: ۴/ ۲۲۹۔ ۳ خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۸۔ ۴ ملاحظہ ہو: ابن بشر (۱/ ۱۸۵) مارد تمان، فلبی ص ۹۷، حاضر العالم الاسلامی (۴/ ۱۶۶) ۵ بلنٹ (۲/ ۲۵۸) ۶ ۷ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ/ ۲۹ ستمبر ۱۸۱۶ء: (جبرتی)

قیادت سے محروم کیا جا چکا تھا۔ ماردتمان کا یہ خیال صحیح نہیں، کہ طوسون کی وفات کے بعد ابراہیم کو اس مہم کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ابراہیم کے بھیجنے کی تجویز جنوری ۱۸۱۶ء ہی میں مکمل ہو چکی تھی اور اگست ۱۸۱۶ء میں یعنی طوسون کے انتقال سے پہلے وہ قاہرہ روانہ ہو چکا تھا۔[1] ابن بشر[2] کے مطابق، عبداللہ بن سعود نے دوسرے سال ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) بھی، ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ دو قاصد (حسن بن مزروع اور عبداللہ بن عون) محمد علی کی خدمت میں مصر بھیجے، اور اب کے ان بھولے بھالے لوگوں نے محسوس کیا کہ والی مصر اپنے عہد سے پھر گیا ہے (وجدوہ قد تغیّر)؛ حالانکہ محمد علی نے کبھی صلح کی تائید کی ہی نہیں۔ البتہ اس کے پہلے دو قاصدوں کو اس نے صاف جواب نہیں دیا تھا۔ اسی سے ابن بشر اور اہل نجد نے محسوس کیا کہ صلح مکمل ہو گئی اور ان کے قاصد کامیاب لوٹے (ورجعوا منه وانتظم الصلح)۔[3] ابن بشر[4] مزید یہ لکھتا ہے کہ محمد علی پاشا نے بعض اہل بادیہ کی "شکایت" کی بناء پر صلح ختم کر دی۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر اس سلسلے میں بعض یورپی معاصروں کی رائے بھی سن لی جائے۔

"...... اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ معاہدہ کی تکمیل محمد علی کی منظوری پر اٹھا رکھی گئی تھی، یا طوسون نے، جو مرتبہ (Rank) میں اپنے باپ کے برابر تھا قطعی طور پر (As a thing done) اس کی تکمیل

۱؎ برک ہارٹ: ص ۱۲۰۔ ۲؎ ابن بشر ۱، ۱۸۵! آخر شوال ۱۲۳۱ھ، تاریخ وفات بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصر اور مصریوں کے متعلق جبرتی کے بیان کو ترجیح ہوگی۔

۳؎ عنوان ۱/، ۱۸۳۔

۴؎ ایضاً: ۱، ۱۸۵۔

کر دی تھی، بہرحال معاملہ کچھ بھی ہو، اس نے صلح کر کے اپنا نقصان کیا۔" محمد علی نے اسے باب عالی میں محض ایک ہنگامی صلح یا التوائے جنگ (Armistice) بنا کر پیش کیا[۱]۔"

برک ہارٹ اس گفت و شنید میں عبداللہ بن سعود کی صفائی اور صاف دلی کی تعریف کرتا ہے، اس کے خطوط بھی برک ہارٹ نے دیکھے تھے[۲]۔ برک ہارٹ اور ربنانج یہ بھی کہتے ہیں کہ محمد علی نے بعد میں الحسا کے زرخیز صوبہ کا مطالبہ کیا اور اسی کے ایفاء پر صلح نامے کی تصدیق ملتوی رکھی۔

ابراہیم پاشا — بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو، طوسون اور عبداللہ بن سعود کے باہمی معاہدے سے غیر مطمئن محمد علی پاشا، والی مصر نے اب نجد کی مہم کے لئے اپنے دوسرے بیٹے[۳] ابراہیم پاشاہ کو نامزد کیا، تیاریاں طوسون کی واپسی کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھیں، البتہ ابراہیم پاشا کی روانگی ایک عرصہ تک ملتوی رہی، وہ ایک بڑی بھاری فوج لے کر ۶ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ ۲۸ ستمبر ۱۸۱۶ء کو ینبع پہنچا اور رسید سے مدینہ کا رخ کیا اور وہاں سے چل کر حناکیہ (پانی کا چشمہ) کے پاس ٹھیرا۔ اس پاس کے بدوی قبیلے مطیع ہوئے، حرب، مطیر، عتیبہ اور عنزہ قبیلوں سے جوق جوق بدو اس کے جھنڈے کے نیچے مجتمع ہو گئے[۴]۔ ابراہیم حناکیہ کے پاس مہینوں رہ گیا، جس کا آس پاس کے بدو قبیلوں پر کافی اثر ہوا، اور وہ ٹوٹ ٹوٹ کر ابراہیم کے پاس جانے لگے۔ عبداللہ کو اس کا احساس ہوا اور آخر اس نے پیش قدمی کی۔ ماویہ (پانی کا چشمہ) کے پاس مڈبھیڑ ہوئی[۵] لیکن عبداللہ بن سعود کی فوج

---

[۱] برک ہارٹ: ص ۲۵۲؛ برائج ص ۱۰۳ — [۲] ص ۲۵۲ — [۳] کہا جاتا ہے کہ ابراہیم پاشا محمد علی کا لڑکا نہیں تھا، بلکہ محمد علی نے ابراہیم کی ماں سے نکاح کر کے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا (عنوان: ۱/۱۰۵، فلبی: ۹۸؛ ہوگارتھ ص ۱۰۱) — [۴] اواخر ۱۲۳۱ھ / نومبر ۱۸۱۶ء۔

مصری توپوں کی تاب دلا سکی[1]۔ عبداللہ قصیم کی طرف پلٹا۔ ابراہیم نے بھی پیچھا کیا اور رس آکر ٹھہرا[2] اور تین مہینے کے محاصرہ کے بعد اہل شہر نے امان طلب[3] کی اس طویل محاصرہ اور مسلسل چھیڑ چھاڑ میں مصریوں کے چھ سات سو آدمی کام آئے۔ اور اہل شہر کے صرف ستر آدمی مقتول ہوئے۔ لیکن اس امان طلبی سے مصریوں کا راستہ صاف ہوگیا، اور ان کی پیش قدمی کو اب کسی کی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

معمولی حملوں کے بعد عنیزہ اور خبرا پر قبضہ ہوگیا (اواخر ۱۲۳۲ھ)۔ بریدہ پر بھی قبضہ میں دقت نہ ہوئی[4]۔ البتہ شقراء میں نجدیوں نے دل کھول کر داد شجاعت دی، لیکن مصری فوج کے فرانسیسی انجینیر[5] (Vaissiere) کی ترکیبوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور اہل شقرا نے بھی امان طلب کی[6]۔

---

[1] وسط جمادی الآخرۃ ۱۲۳۲ھ / ۲ مئی ۱۸۱۷ء [2] اواخر شعبان ۱۲۳۲ھ / اوائل جولائی ۱۸۱۷ء

[3] ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ / ۲۳ اکتوبر ۱۸۱۷ء [4] محرم ۱۲۳۳ھ / نومبر ۱۸۱۷ء

[5] ابراہیم کے ساتھ اس فرنچ انجینیر کے علاوہ چار ایطالی ڈاکٹر بھی تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: Scots, Gentili, Todeschini, Socio (ہوگارتھ: ص۱۲۱) ان میں Scots اس کا خاص طبیب تھا۔ عسیر اور یمن کی مہموں میں بھی مصری فوج میں متعدد یورپی افسر تھے (ہوگارتھ: ص۱۲۶، ۱۲۳)

برک ہارٹ، طوسون کے فوج کے ایک انگریز افسر Thomas Keith کی بہادری کا ذکر کرتا ہے۔ یہ اسلام لے آیا تھا اور ابراہیم آغا کے نام سے موسوم تھا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ خود عبداللہ بھی اس کی شجاعت کا مداح و معترف تھا۔

[6] ۱۴ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ / ۲۲ جنوری ۱۸۱۸ء: بلنٹ ۲/ ۲۶۰

اس کے بعد ایک اور فیصلہ کن جنگ ضرمی کے قریب ہوئی۔ نجدی علاقے میں پائے تخت درعیہ کے بعد سب سے مستحکم شہر ضرمی ہی تھا۔ اس سے پہلے رس اور شقراء کے باشندے بھی بہادری سے لڑے، لیکن آخر امان طلب کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان دونوں کے برعکس ضرمی "عنوۃ" فتح ہُوا۔ بازاروں اور گھروں میں باشندے قتل کئے گئے اور تمام مال و متاع فاتحوں نے لوٹ لیا، اور بلنٹ (۲: ۲۶۰) کے بیان کے مطابق عورتوں کی آبرو بھی ترکی سپاہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ / ۲۴ فروری ۱۸۱۸ء کو ضرمی میں مصریوں کا داخلہ ہوا یہ گویا نجدی حکومت کے زوال کا اعلان تھا۔

سعود بن عبداللہ بن محمد بن سعود اور اس کے ساتھ کچھ درعیہ کے جان نثار شہر کے ایک قصر میں قلعہ بند ہو گئے۔ آخر انہیں بھی امان دی گئی، اور وہ لوگ درعیہ چلے گئے ان کے ساتھ اہل شقراء کے تین ہزار سے اوپر بچے اور عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کو امیر عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز نے درعیہ میں پناہ دی۔[1]

سقوط درعیہ

اب ابراہیم پاشا درعیہ کے سامنے تھا، جہاں وہ چھ ماہ تک محاصرہ کئے پڑا رہا۔ روزانہ جنگ ہوتی، اور مصری بڑی تعداد میں کام آتے، لیکن وہاں آئے دن مصر سے تازہ دم کمک آتی رہتی اور یہاں درعیہ والوں کی تعداد روز کم ہوتی جاتی۔ رسد اور اسلحہ کی کمی الگ انہیں ستاتی تھی۔ امیر عبداللہ بن سعود، اس کے اہل خاندان اور شیخ الاسلام کے بیٹے پوتے، سب بلا استثناء جی کھول کر لڑے۔ آخر اہل شہر نے صلح و امان طلب کی۔[2] عبداللہ بن سعود کو اب بھی ہتھیار ڈالنے

---

[1] عنوان: ۱، ۱۹۳ [2] ۸، ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ / ۸ ستمبر ۱۸۱۸ء؛ عنوان: ۱، ۲۰۶؛ ہارڈ تمان نے سقوط... درعیہ کی تاریخ ۱۱ ستمبر ۱۸۱۸ء دی ہے

میں پس وپیش تھا۔ شہر کے اندر اپنے خاندانی قلعہ (طُریف) میں پناہ گزیں ہو کر لڑنے لگا، لیکن قلعہ کی دیواریں بے کار ہوچکی تھیں اور اب مدافعت بے کار تھی۔ آخر اس نے اپنے کو ابراہیم کے سپرد کر دیا[1]۔ اور یہ پہلی 'سعودی حکومت' اور فلبی کی زبان میں "فرسٹ وہابی امپائر" (جس کی تعمیر میں شیخ الاسلام اور ان کے ہم جلیسوں کا بڑا ہاتھ تھا) کے خاتمہ کا اعلان تھا۔

عبداللہ بن سعود کا حشر

صلح کے دو روز بعد عبداللہ بن سعود کو سفر کا حکم دیا گیا۔ تین چار آدمی اس کے اپنے بھی ساتھ رہے۔ امیر نجد کا قافلہ محرم ۱۲۳۴ھ (نومبر ۱۸۱۸ء) کے اوائل میں مصر پہنچا، اس کا داخلہ نہایت مضحکہ انگیز صورت میں ہوا۔ بیچارے کو مصریوں نے تماشا بنا لیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایک شکست خوردہ والی مملکت کے ساتھ جو کچھ بدسلوکی روا رکھی جا سکتی تھی، اس میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی گئی[2]۔ محمد علی کی خدمت میں وہ حاضر ہوا۔ کچھ ضابطہ کی باتیں ہوئیں، اور ۱۹ر محرم کو اسے اسکندریہ اور وہاں سے آستانہ بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ۱۷ر دسمبر ۱۸۱۸ء[3] (۱۸ر صفر ۱۲۳۴ھ) کو وہ اور اس کے ساتھی، ایا صوفیا کے صحن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دار الخلافت میں بھی ان مقہوران بلا کو بری طرح سے گشت کرایا گیا۔

عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود کے ساتھ امراء نجد کا وہ سلسلہ

---

[1] ۹ ستمبر ۱۸۱۸ء؛ مارد تمان؛ فلبی: ص ۱۰۳

[2] جبرتی: ۱/ ۲۹۸؛ خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۲ [3] ماردتمان اور Hughes (ص ۲۶۴) نے پھانسی کی تاریخ ۱۹ر دسمبر لکھی ہے۔ ابن بشر اور جبرتی نے تاریخ کی تعیین نہیں کی۔

ختم ہو جاتا ہے، جو براہ راست شیخ الاسلام سے مستفید ہوا تھا۔ عبدالعزیز بن محمد بن سعود اور سعود بن عبدالعزیز تو شیخ الاسلام کے باضابطہ شاگرد تھے، عبداللہ بن سعود کی عمر شیخ الاسلام کی وفات (۱۲۰۶ھ) کے وقت کم رہی ہو گی، اس لئے ممکن ہے کہ وہ باضابطہ ان کے درس سے نہ مستفید ہوا ہو، پر اتنا یقینی ہے کہ اس نے شیخ الاسلام کا زمانہ پایا تھا۔

عبداللہ کو اطمینان سے حکومت کا موقع بالکل ہی نہیں ملا، پھر بھی درس و تبلیغ نیز انتظام حکومت میں وہ بالکل اپنے باپ اور دادا کے نقش قدم پر رہا۔ اور اس سلسلہ میں کوئی نئی بات قابل ذکر نہیں[1]۔

باقی لوگوں کا انجام درعیہ کے اندر اور باہر مسلسل چھ مہینے لڑائی ہوتی رہی، ان معرکوں کی تفصیل، اس کتاب کی محدود گنجائش اور اس کے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ان واقعات کے معاصر اور شاہد ابن بشر نے پوری تفصیل دی ہے، بلکہ شہر کے مختلف مورچوں اور ان کے جائے وقوع کی بھی کافی توضیح کی ہے[2]۔

اس لڑائی میں صرف آل سعود کے اکیس (۲۱) افراد شہید ہوئے۔ ان میں سے ممتاز اشخاص کے نام یہ ہیں:- فیصل بن سعود، ابراہیم بن سعود، فہد بن عبداللہ بن عبدالعزیز، فہد بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود، محمد بن حسن بن مشاری بن سعود، ابراہیم بن حسن بن مشاری، عبداللہ بن حسن بن مشاری، عبدالرحمٰن بن حسن بن مشاری، عبداللہ بن ابراہیم بن حسن بن مشاری، ابراہیم بن عبداللہ بن فرحان، عبداللہ بن ناصر بن مشاری، محمد بن عبداللہ بن محمد بن سعود، سعود بن عبداللہ بن

(۱) عنوان ۱: ۲۰۹۔ (۲) عنوان المجد ۱: ۲۰۸ - ۱۹۴

محمد بن سعود، محمد بن سعود بن عبداللہ بن محمد بن سعود اور آل الشیخ میں سے مندرجہ ذیل اشخاص شہید کیے گئے۔[1]

سلیمان بن عبداللہ بن الشیخ، علی بن عبداللہ الشیخ،[2] محمد بن عبدالرحمن بن حسن بن الشیخ۔[3] ان میں سے سلیمان بن عبداللہ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور پورے جسم کی تکا بوٹی کی گئی۔ اللہ رے جوشِ انتقام!![1]

آل سعود اور آل الشیخ کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء اور اعیان شہید ہوئے۔ ان میں سے بعض میدان جنگ میں کام آئے اور اکثر سنگینوں، بندوقوں اور مختلف قسم کی اذیتوں کا شکار ہوئے۔

علی بن حمد بن راشد عرینی، قاضی خرج، صالح بن رشید الحربی، عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن سویلم، حمد، بن عیسیٰ بن سویلم، محمد بن ابراہیم بن سدحان۔[2] ان مقتولین کے علاوہ بعض مشہور اہل علم کے ساتھ ابراہیم پاشا انتہائی بدتمیزی سے پیش آیا۔ قاضی احمد بن رشید الحنبلی، مدینہ کے مشہور عالم امیر عبداللہ کے ہاں مقیم تھے، زدوکوب سے ان کی تواضع کی گئی اور تمام دانت اکھاڑ ڈالے گئے۔[3]

یہ قاضی احمد بن رشید، جن کا پورا نام احمد بن حسن بن رشید ہے، احساء کے رہنے والے اور فقہ حنبلی کے مشہور عالم تھے۔ عام طور پر الحنبلی کے نام سے شہرت تھی۔ پہلے یہ شیخ کی دعوت کے مخالف تھے، پھر مؤید ہو گئے، مدینۃ الرسول کا جوار پسند آگیا تھا، وہیں متوطن ہو گئے تھے، بڑی عمر پاکر وہیں وفات پائی۔[4]

[1] عنوان: ۱، ۲۱۰۔ [2] ایضاً: ۱، ۲۰۸۔ [3] ایضاً [4] ۱۲۴۹ھ

"السحب الوابلۃ" (صفحہ ۳۵-۳۳) میں ان کا مفصل ذکر ہے لیکن ان کے قبول دعوت کی السحب کے مصنف نے عجیب وغریب تاویلیں کی ہیں۔

اسی سلسلہ میں شیخ عبدالعزیز الحصین ناصری (ف ۱۲۳۷ھ) جیسے ضعیف عالم اور بزرگ کے ساتھ بدسلوکی کا قصہ بھی آتا ہے۔ فتح شقرا کے وقت شیخ عبدالعزیز الحصین بھی وہاں تھے۔ ابراہیم پاشا نے انہیں اپنی مجلس میں بلوایا، ضعیفی کی وجہ سے وہ خود نہ آسکتے تھے، مجبوراً لوگ انہیں اٹھا کر لائے (فجئ بہ محمولاً)

انہوں نے آتے ہی مسنون طریقہ پر:

سلامٌ علیک یا ابراہیم،

کہا، مصری پاشا کی پرغرور پیشانی پر شکن پڑگئی۔ اور وہ شیخ عبدالعزیز کا تمسخر کرنے لگا۔ شیخ نے نصیحت شروع کی، اور "عفو" کی چند آیتیں پڑھیں۔ تو پاشا نے کہا: "جا بڈھے میں نے تیرا قصور معاف کیا"[1]

یہ وہی شیخ عبدالعزیز ہیں، جو شیخ الاسلام کے خاص شاگرد تھے، اور خود ان کی زندگی میں دو مرتبہ (۱۱۸۵ھ۔ ۱۲۰۴ھ) "وفد" کی حیثیت سے حجاز بھیجے گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (پہلا باب)

اس دار وگیر سے جو خوش نصیب بچ کر نکل سکے۔ ان میں ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود (جس کے ہاتھ آگے چل کر نجدی حکومت کی تجدید ہوئی) اور شیخ علی بن حسین بن شیخ الاسلام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آل سعود کے بعض افراد اس وقت تو بچ کر نکل گئے، اور جب پھر وہ درعیہ لوٹے تو مصری حاکم

---

[1] عنوان: ۱، ۱۹۱

نے انہیں پکڑ کر مصر بھیج دیا[1]۔ ان کے علاوہ آل سعود اور آل الشیخ کے باقی ماندہ افراد مع اہل و عیال کے مصر بھیج دیئے گئے۔ جہاں یہ غریب الوطن عرصہ تک مقیم رہے۔ بعض وہیں لقمۂ اجل بنے، اور اکثر حالات سازگار ہونے پر اپنے وطن کو واپس ہوئے[2]۔ غریب الوطنوں کا یہ قافلہ ۸ار رجب ۱۲۳۴ھ (۱۳ر مئی ۱۸۱۹ء) کو مصر پہنچا، ان کی تعداد عورت، مرد اور بچوں کو ملا کر چار سو کے قریب تھی۔ (جبرتی: ۴، ۳۰۳)

درعیہ کی بربادی | درعیہ پر قبضہ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ کے اوائل میں ہوا، لیکن اس کی تباہی و بربادی کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا، خود ابراہیم پاشا کوئی نو مہینے وہاں رک گیا۔ روز نیا حکم جاری ہوتا اور اس کی پابندی کرائی جاتی جب تمام مرحلے طے ہو گئے، تو پھر آخر میں ایک ایسی ضرب لگائی گئی۔ جس سے آل سعود کا یہ پہلا پایہ تخت پھر نہ پنپ سکا۔

شعبان ۱۲۳۴ھ (جون ۱۸۱۹ء) میں محمد علی پاشا کا حکم پہنچا اور اس کے مطابق لائق بیٹے (ابراہیم) نے درعیہ کی بربادی کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا:

"مصری فوج نے سارا شہر کھود کر پھینک دیا۔ تمام باغ و نخلستان جڑ سے کاٹ ڈالے۔ بوڑھے، بچے، کمزور اور بیمار سب یکساں عتاب کا شکار ہوئے، گھروں

---

[1] ۱۲۳۶ھ؛ خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۳

[2] ان ہی واپس ہونے والوں میں نجد کے دو مشہور عالم شیخ عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام اور ان کے صاحبزادے شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن حسن بھی تھے، جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو (ص ۴۸-۴۹)

میں آگ لگادی گئی اور چند روز میں لہلہاتا ہوا باغ جل کر خاک بھسم ہوگیا[1]

یہ مصریوں کے جنونِ انتقام کا سب سے بدترین مظاہرہ تھا۔ یہ وہ درعیہ ہے، جو شیخ کی دعوت سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ شیخ کی دعوت نے اسے مرکزیت بخشی اور آلِ سعود کی کوششوں اور حوصلہ افزائیوں سے تھوڑے عرصہ میں ایک آباد اور خوش حال شہر بن گیا۔ ابن بشر درعیہ کی خوش حالی، رونق اور تجارتی مرکزیت کا شاندار لفظوں میں ذکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے اپنے چشم دید تاثرات خاص اہمیت رکھتے ہیں[2]۔

سرکار برطانیہ کی مبارک باد اور امداد کی پیش کش

درعیہ کو خاک سیاہ کرنے کے بعد ابراہیم نجد کے علاقے سے واپس ہوا چاہتا تھا کہ ہماری سرکار کے ہندوستانی افسروں کو ایک عجیب تجویز سوجھی۔ انھوں نے ابراہیم کو مبارک باد دینے کے لئے ایک خاص وفد کپتان جارج فارسٹر سیڈلیر George Forester Sadlier کی ماتحتی میں روانہ کیا۔

اس مبارک باد کی تہ میں جو جذبہ کام کر رہا تھا، اس کے سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کمپنی کی حکومت خلیج فارس کے ساحل پر اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کے لئے عرصہ سے کوشاں تھی۔ نجدی اقتدار ساحل پر بڑھا[3] تو بحری

---

[1] عنوان المجید: ۱، ۲۱۳؛ تاریخ نجد (آلوسی): ص ۲۶-۲۷۔

[2] عنوان: ۱، ۲۱۴۔

[3] یہاں پر یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ساحل پر نجدی اثر بڑھتے ہی برطانی افسروں نے نجدیوں سے بھی خلا ملا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بصرہ کے

تاخت کی رفتار تیز ہوگئی اور تجارتی جہازوں کو نقصان پہنچنے لگا۔ اس بحری قزاقی (Piracy) کا خاتمہ کرنے کے لئے حکومت بمبئی نے ۱۲۲۴ھ ۱۸۰۹ء میں قرصان کے مرکز راس الخیمہ پر حملہ کیا اور اسے جلاکر خاک سیاہ کر دیا جسکا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

اب جو کمپنی کی حکومت کو مصری فتوحات اور نجدیوں کی تباہی کی خبر ملی، تو اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں اس نئی طاقت کے ہاتھوں بھی اس کے اقتدار کو صدمہ نہ پہنچے۔ درعیہ کے قبضہ کے ساتھ ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے ان کا اندیشہ قوی ہوگیا۔ مصری فوجی دستے خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر تنگ و تاز کرنے لگے، اور اس میں انھوں نے برطانوی حلقۂ نفوذ و اثر کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ برطانی افسر اپنے نجدی حریفوں کی بربادی پر تو بہت خوش تھے، لیکن مصریوں کے ہاتھوں اس ناروا برتاؤ کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔[۵۱] فوراً کپتان ج۔ف۔ سیڈلیر کو ابراہیم پاشا کی خدمت میں درعیہ بھیجا گیا۔ اصل میں برطانی افسروں کو مصریوں کے غرض و غایت کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ خلیج فارس تو کجا، مصری نجد پر بھی دائمی قبضہ یا حکومت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ درعیہ کی فتح کے ترنگ میں، ممکن ہے، انھوں نے آس پاس کے علاقوں پر دستے بھیجے ہوں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ پائدار اور منظم حکومت قائم کرنے کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۸) برطانی ریزیڈنٹ مینستی Manesty نے ۱۷۹۹ء میں رینانڈ (Reinand) کو خاص اسی غرض سے درعیہ بھیجا تھا، اور اس وقت اسے عارضی کامیابی بھی ہوگئی تھی۔ ہوگارتھ (حاشیہ ص۱۰۲)۔

۵۱ فلبی: ص۱۰۳

ارادہ انھوں نے کبھی نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ابراہیم پاشا درعیہ کو تباہ کرنے کے بعد سارے علاقے کو عام ابتری کی حالت میں چھوڑ کر مصر روانہ ہوگیا۔

خیر اب آئیے، ذرا سیڈلیر کے مشن کی سرگزشت ایک واقف کار کی زبانی سنئے:-

" مصریوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ، کسی طرح کا مشورہ کئے بغیر، بمبئی سے ۱۸۱۹ء (۱۲۳۴ھ) کے موسم گرما میں ایک برطانی جنگی جہاز خلیج کی طرف بھیجا گیا۔ اس پر سرکار (His Majesty) کی سینتالیسویں (Forty Seventh) رجمنٹ کا افسر، کپتان ج۔ ف۔ سیڈلیر بھی ایک خاص قاصد (Emissary) کی حیثیت سے ساتھ تھا۔ اس کی مہم کا مقصد " ابراہیم کو درعیہ کے زیر کرنے پر مبارکباد دینا" اور " پاشا (His Excellency) سے مل کر وہابی طاقت کے مکمل استیصال کا مناسب انتظام کرنا تھا"۔

اس افسر کے ہدایت نامے کے مزید فقرے یہ ہیں:

" اگر، جیسا کہ غالباً صورت حال ہو، پاشا برطانی حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھانا چاہے تو ایک مکمل اور مضبوط بحری فوجی طاقت جلد از جلد بھیجی جائے گی، اور " ترکوں" [مصریوں] کو راس الخیمہ پر قبضہ دلا دیا جائے گا۔۔۔ الخ"

" لیکن تاریخ میں بہت کم خفیہ مشن ایسے ناکام ہوئے ہوں گے، جیسا کہ سیڈلیر مشن کی قسمت میں لکھا تھا"[1]

تفصیل بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ سیڈلیر عرب کے ساحل پر اس وقت اترا جب

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: Penetration of Arabia (Hogarth) کی صفحہ ۱۱۱-۱۰۴

ابراہیم درعیہ کی بربادی سے سیر ہو کر وطن کی واپسی کا ارادہ کر رہا تھا۔ بتانے والوں نے اسے بتایا کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے ________ ملاقات کس مقام پر ہو سکے گی؟" یہ ۲۸ رجون ۱۸۱۹ء کو روانہ ہوا۔ درعیہ کے پاس سے گزرتا ہوا شقراء پہنچا۔ وہاں سے رس آیا۔ یہاں اسے ابراہیم کی فوج تو ملی لیکن خود پاشا مدینہ کے لئے رخت سفر باندھ چکا تھا۔ ابراہیم کو اس کی آمد کی اطلاع تھی لیکن وہ کوئی ایسا ملنے کا مشتاق نہیں تھا، کہ اس کا انتظار کرتا۔ آخر مدینہ کے قریب پاشا کی خدمت میں ۸۔ اور ۹ ستمبر کو باریابی ہوئی۔

پاشا نے گفتگو تو اخلاق سے کی، لیکن کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا۔ اور برطانی قاصد ناکام واپس آیا۔ البتہ اس نے اس تین مہینے کی بادیہ گردی سے ایک بڑا امتیاز حاصل کر لیا۔ یہ پہلا یورپی تھا، جس نے جزیرۃ العرب کو ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک عبور کر لیا۔

درعیہ مصریوں کے ہاتھوں ایسا برباد ہوا کہ پھر نہ آباد ہو سکا۔ یہ تباہی ایسی حوصلہ شکن تھی، کہ ایک عرصہ تک نجدیوں کے پنپنے کی کوئی امید نہیں دکھائی دیتی تھی، بلنٹ[۵۱] جیسے وسیع النظر اور بظاہر عربوں کے ہمدرد مدبر نے ۱۸۸۰ء میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا:

"عرب میں سعودی خاندان کے اقتدار کو اب قصہ ماضی سمجھنا چاہیئے"

ڈاوتی[۵۲] (Daughty) نے ۱۸۷۵ء میں اہل نجد کی عام رائے نقل کرتا ہے:

"اب وہابی حکومت دوبارہ زندہ نہیں ہونے کی۔ کم از کم نجد میں یہی خیال

۵۱۔ ۲۶۸، ۵۲: ۴۲۵ ۔

کیا جاتا ہے۔"

اور زویمر[۵۱] جیسے دشمن اسلام نے سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ رائے ظاہر کی:

"اس تحریک کا خاتمہ انتہائی ناکامی پر ہوا اور سیاسی طور پر یہ ایک شاندار ڈھونگ ثابت ہوئی۔"

دوسری[۵۲] جگہ یہی دشمن اسلام و عرب لکھتا ہے:

"عرب میں سعودی خاندان کے اقتدار کو اب 'قصہ ماضی' سمجھنا چاہیے۔"

لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ جزیرۃ العرب کی امانت پھر انھیں نجدیوں کو ملی اور پہلے سے زیادہ وسعت و اقتدار کے ساتھ۔ ہاں درعیہ پھر نہ بن سکا، نجدی حکومت کی تجدید اور تشکیل درعیہ میں نہیں بلکہ اسی علاقے کے دوسرے مقام ریاض میں ہوئی، اور اب وہی ان کا پایہ تخت ہے۔

درعیہ کا مرثیہ | درعیہ جیسی جگہ پر جان گداز فاجعہ کا اہل نجد اور ان کے ہمدردوں پر جو کچھ اثر ہوا ہو گا، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ رونے والے اپنے اپنے مقدور

---

[۵۱] صفحہ ۱۹۱۔ [۵۲] بحوالہ فلبی (صفحہ ۱۰۲)، فلبی (صفحہ ۱۶۰) کو حیرت ہے کہ زویمر کا یہ ریمارک اس کی کتاب کے سنہ ۱۹۱۲ء کے ایڈیشن میں بھی اسی طرح قائم ہے۔ حالانکہ موجودہ سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود سنہ ۱۹۰۱ء میں ریاض پر قابض ہو چکا تھا۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا کہ گارنیٹ (ص ۸) نے سنہ ۱۹۰۴ء میں اس تحریک کے پنپنے اور دوبارہ بڑھنے کی توقع ظاہر کی تھی، گو ریاض پر دوبارہ قبضہ کے بعد یہ پیشین گوئی کوئی ایسی قابل تعریف بھی نہیں، البتہ زویمر کا جہل حیرت انگیز ہے۔

اور ظرف کے مطابق خون کے آنسو روئے ہوں گے۔ ہم ذیل میں صرف ایک مرثیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مرثیہ نجد کے مشہور عالم حمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ، شاگرد شیخ الاسلام) کے بیٹے عبدالعزیز بن حمد بن ناصر (ف ۱۲۴۴ھ) کا لکھا ہوا ہے، گو اس میں شریف رندی کے مرثیہ سقوط طلیطلہ[۱] یا سعدی کے نوحہ بغداد[۲] کا زور نہیں ہے، پھر بھی اس میں درد ہے اور ایک دیندار قوم کے صبر و شکر کا آئینہ۔ مرثیہ کا مطلع[۳] یوں ہے :-

الیک اله العرش اشکو تضرعا ودادعوک فی ضراء ربی لتسمعا

نمونہ کے طور پر دو چار شعر اور درج ہیں۔

وکم قتلوا من عصبة الحق فتیة هداة وضاة ساجدین ورکعا

وکم دمروا من مربع کان اهلا فقد ترکوا الدار الانیسة بلقعا

---

[۱] ابو البقاء، صالح بن شریف رندی کا مشہور مرثیہ جس کا مطلع یہ ہے :-

لکل شیء اذا ما تم نقصان فلا یغر بطیب العیش انسان

طلیطلہ کا سقوط صفر ۴۷۸ھ میں ہوا۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سقوط غرناطہ (۸۹۷ھ) کا مرثیہ ہے مگر صحیح یہی ہے کہ یہ سقوط غرناطہ سے تین سو برس پہلے کہا گیا تھا (نفح الطیب جلد ۳ صفحہ ۵۹۴)۔

[۲] زوال بغداد (۶۵۶ھ) کا مرثیہ جس کا مشہور مطلع یہ ہے :

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

بر زوال ملک مستعصم، امیر المومنین

[۳] عنوان، ۲، ۴۳،

مضوا وانقضت ایامہم حین اوردوا — ثناء وذکرا طیبہ قد تضوعا

فجازاہم اللہ الکریم بفضلہ — جنانا ورضوانا من اللہ ارفعا

الا ایہا الاخوان صبرا فاننی — اری الصبر للمقدام ذخرا وانفعا

ولا تیاسوا من کشف ما ناب انہ — اذا شاء ربی کشف ذاک تمزعا

درعیہ کی تباہی کے ساتھ (۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء) شیخ کے تربیت کردہ اور اصلاح یافتہ نجد کی سیاسی برتری ختم ہو جاتی ہے۔ نجد جدید[1] اور اس کی ترقی ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ اس لئے نجدی حکومتوں کا قصہ چھوڑ کر ہمیں اب

۱؎ نجد کی تاریخ کے تین دور ہو سکتے ہیں:-

(۱) درعیہ کی سربلندی سے لیکر ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء تک، جب کہ مصریوں کے حملوں اور درعیہ کی تباہی کے باعث ان کی قوت تتر بتر ہو گئی۔

(۲) ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود (۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء تا ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء سے ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء اور ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء تا ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء) کی بازیابی کی کوششوں سے شروع ہو کر ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء تک جب کہ محمد بن عبد اللہ آل الرشید (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء سے ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) امیر حائل نے حائل اور ریاض، نجد کی دونوں ریاستوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے مجتمع کر لیا۔

(۳) تیسرا زرین دور (فلبی کی زبان میں "سکنڈ وہابی امپائر") ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء سے شروع ہوتا ہے، جب کہ موجودہ فرماں روا عبد العزیز بن عبد الرحمن بن فیصل بن ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود نے آل الرشید سے ریاض واپس لے لیا۔

شیخ اور ان کے تصنیفات کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

ہاں اس سلسلے میں نجدی اور مصری لشکر کا باہمی فرق اور محمد علی اور ابراہیم پاشا کے مزاج واخلاق کے متعلق بھی دو حرف عرض کر دیا جائے، تو شاید نامناسب نہ ہو۔

مصری فاتح مصریوں اور نجدیوں کے درمیان عرصہ تک جنگ وپیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع مصریوں کو کافی زک اُٹھانا پڑی، لیکن نجدیوں نے اسلامی قانون جنگ، کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی اور ان کی سپاہ کی شدت اور تقشف کے متعلق جو کچھ کہا جائے، پر اخلاقی کمزوریوں اور فسق وفجور کی مثالیں نہیں پیش کی جا سکتیں۔ رہے محمد علی اور ابراہیم اور ان کے ساتھی تو ان کے رویہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں "اسلامیت" چھو بھی نہیں گئی تھی اور پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں عام طور پر مسلمان انحطاط کی کس حد تک پہنچ چکے تھے۔

نجدی اور مصری فوجوں کا باہمی فرق معلوم کرنے کے لئے، مشہور معاصر مصری مورخ جبرتی کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔ محرم سنہ ۱۲۲۷ھ کے حوادث میں مصریوں کی شکست سے بحث کرتے ہوئے، ایک مصری فوجی افسر (لقد قال لی بعض اکابرھم) کی زبانی لکھتا ہے:-

"ہمیں فتح کیسے نصیب ہو؟ ہماری فوج کا بڑا حصہ بے دین ہے، کسی آئین کی پابندی نہیں۔ بجس کے بکس مسکرات سے بھرے ہوئے ساتھ ہیں، ہماری چھاؤنی میں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کے دلوں میں دین اور شعائر

دین کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور یہ قوم (یعنی نجدی، ——— عربی تعبیر "القوم" ہے) وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے اور ایک امام کے پیچھے خشوع اور خضوع کے ساتھ صف بندی کرتی ہے۔ اگر جنگ کے دوران میں کہیں نماز کا وقت آگیا، تو موذن اذان دیتا ہے اور سب نماز خوف پڑھتے ہیں۔ ایک جماعت جنگ کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ پھر دوسرا گروہ نماز کے لئے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور ہماری فوج حیرت سے منہ تاکتی ہے۔ ان بے چاروں نے دیکھنا تو درکنار، سُنا بھی نہیں"[1]

ہم اپنے قلم کو ان برائیوں کے تذکرے سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے، جو اس مصری فوجی افسر کے بیان کے مطابق مصری فوج نے بدر اور اس کے نواح میں روا رکھی تھیں۔ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اہل علم اور شرفاء کے گھروں کی بھی آبرو برقرار نہیں رہی تھی۔[2]

یہ تو ایک فوجی افسر کا بیان تھا۔ جبرتی کی اپنی روایت بھی ملاحظہ ہو، رمضان ۱۲۳۳ھ کے حوادث میں لکھتا ہے:۔

"خشکی اور سمندر کی راہ سے فوجیں تین دفعات میں آگے پیچھے شعبان اور رمضان کے مہینوں میں روانہ ہوئیں۔ ۔ ۔ ۔ اور ان لوگوں نے سفر کا عذر کر کے روزے نہیں رکھے ان کی بڑی تعداد بازاروں میں بیٹھ کر کھاتی پیتی ہے (یہ لوگ) ہاتھوں میں تمباکو کا ناریل لئے ہوئے بے شرمی کے ساتھ سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے مخالف

---

[1] جبرتی: ۳/۱۴۰، [2] ایضاً۔

اور کفار سے جہاد اور غزوہ کے لئے جا رہے ہیں۔[1]

جب دین اور دینی نظام کے احترام کا یہ عالم تھا، تو پھر درعیہ کی بربادی اور نجد پر قبضہ کے بعد ابراہیم پاشا کا دماغ پھر گیا، تو اس پر تعجب کیوں ہو؟ جبرتی فاتح نجد کی انانیت اور تکبر کا شاکی ہے،

"اس "غیبت" کے بعد ابراہیم پاشا اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگا ہے اور اس کے غرور کی کوئی حد نہیں رہی؛ حتی کہ جب علماء (مشائخ) اس کے پاس سلام کرنے، اور تشریف آوری پر مبارکباد دینے گئے تو وہ ان کی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوا اور ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ آخر وہ لوگ بیٹھ گئے اور خیر وعافیت پر مبارکباد پیش کرنے لگے؛ تو اس نے اشارہ سے بھی جواب نہیں دیا، بلکہ ایک دوسرے شخص سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا۔ وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر لوٹ گئے۔[2]

کیا اس پر کسی اظہار رائے کی ضرورت ہے؟

محمد علی کی مکاری اور مظالم محمد علی پاشا کے مظالم کو ہم یہاں دھرانا نہیں چاہتے۔ برک ہارٹ (جس نے محمد علی کے عہد حکومت میں حجاز اور جزیرہ عرب کی سیاحت کی تھی اور جسے "وہابیوں" کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی بھی نہیں) نے اس کے مظالم کی مفصل داستان لکھی ہے۔[3]

---

[1] ۴ : ۲۸۹۔ [2] ایضاً : ۴، ۳۰۶؛ جبرتی کے علاوہ ہوگارتھ (ص ۱۰۱) نے بھی ابراہیم پاشا کی "سیرت" کا نہایت اچھا خاکہ کھینچا ہے۔

[3] برک ہارٹ : ۳۵۲، ۳۲۳، ۳۱۷، ۳۱۸، ۲۴۲۔

جو مستند اور قابل وثوق ہے۔ بعض مبصر ابراہیم کے غدر اور مکر و فریب کی بھی ساری ذمہ داریاں محمد علی ہی کے سر ڈالتے ہیں:۔

"جس بے رحمی اور دغا بازی کا برتاؤ معزول بادشاہ اور عام وہابیوں کے ساتھ کیا گیا، اس کا الزام بھی ابراہیم سے زیادہ محمد علی کے سر عائد ہوتا ہے۔"[۵۱]

برک ہارٹ، محمد علی کی "رشوت ستانی" کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق بدوؤں کو رشوتیں دے کر محمد علی نے کامیابی حاصل کی:۔

"مصریوں کی طرف، بدوؤں کی ہمدردی مبذول کرنے میں رشوت کا بہت دخل تھا۔"

اس نے محمد علی کے مظالم اور بے رحمانہ قتل کی بھی کافی مثالیں دی ہیں۔ یہی سیاح ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"محمد علی نے اپنے سپاہیوں کی طاقت سے زیادہ، روپیہ کے ذریعہ عرب پر اپنی دھاک بٹھائی۔"[۵۲]

ان کے مقابلہ میں نجدی وہابیوں کے بارے میں ایک عینی شاہد (مشہور اسپینی سیاح بیدیا Badia عرف علی بے عباسی کا بیان سنئے، جو نجدیوں کے قبضہ کے وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھا۔

"جب تک وہ یہ نہ جان لیں کہ فلاں چیز دشمن یا مشرک کی ہے، اسے ہاتھ نہیں لگاتے اور زبردستی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ تمام چیزیں قیمت دے کر خرید تے ہیں۔ اسی طرح ہر خدمت کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ اپنے سردار کے اندھے اطاعت شعار ہونے کی وجہ سے، اس کے احکام کی تعمیل میں ہر مشقت

---

۵۱ ہوگارتھ: ص ۱۰۳ ۵۲ صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۲ -

برداشت کرنے کو تیار رہتے ہیں"۔[۵۱]

علی بے سے بھی زیادہ محقق سیاح برک ہارٹ جو ۱۸۱۴ء میں (یعنی محمد علی کے قبضہ کے وقت) مکہ پہنچا تھا، اور جس کی کتابیں اس کے صحت بیان اور دقت نظر کی شاہد ہیں، لکھتا ہے:-

"وہابی اقدام کی تہ میں بری رسموں کے ختم کرنے کی زبردست مخلصانہ خواہش کام کر رہی تھی۔ غدار سے غدار دشمنوں سے بھی انھوں نے وعدہ شکنی نہ کی۔ اگر ترکوں (مصریوں) سے ان کے طرز عمل کا مقابلہ کیا جائے تو ہمیں ترکوں کی تمام وہ جہالات گنانا پڑیں گی جن میں وہ آلودہ ہیں"[۵۲]

برک ہارٹ کی پوری کتاب میں سعود اور عبداللہ کے لئے تعریف[۵۳] کے سوا کچھ نہیں۔

---

۵۱ ہوگارتھ: صفحہ ۷۸۔

۵۲ ہوگارتھ: صفحہ ۷۹۔

۵۳ برک ہارٹ: ۲، ۱۸۰-۱۲۰۔

تیسرا باب

تصنیفات | حکیم مشرق اور جدید دنیائے اسلام کے پہلے سیاسی مفکر، سید جمال الدین افغانی (ف ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) کے متعلق عصر حاضر کے مشہور عرب سیاست دان اور مجاہد امیر شکیب ارسلان (مولود ۱۸۶۹ء) نے ایک جگہ کیا خوب لکھا ہے:۔[1]

"انھیں تصنیف و تالیف کی کثرت سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کتابوں کے مولف نہیں تھے، بلکہ حکومتوں اور قوموں کے مصنف تھے"

شیخ الاسلام کے متعلق بھی یہ فقرہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرایا جا سکتا ہے پھر بھی تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں شیخ نے جو کچھ لکھا، وہ کچھ ایسا کم بھی نہیں ہے۔ نیز علمی لحاظ سے بھی اس کا پایہ بلند ہے۔ ان تحریروں میں متکلمانہ موشگافیاں اور یونانی علوم سے متاثر متاخرین فقہاء کی دور از کار باتیں نہیں ملیں گی۔ وہ ٹھیٹھ محدثانہ طریقہ پر لکھتے ہیں۔ جو بات کہی دو ٹوک سیدھے سادھے الفاظ میں، کتاب و سنت کے نصوص سے آراستہ و پیراستہ ادربس۔ سچائی اور حقانیت کے پیکر کو ظاہری جمال و آرائش کی کیا ضرورت؟ سچائی اپنے اندر خود ایک نامعلوم کشش رکھتی ہے۔

---

[1] حاضر العالم الاسلامی (۲: ۳۰۱) اصل عبارت یوں ہے: "و بالجملة فانه لم یکن یحفل بوفرة التصانیف؛ وانما کان مؤلف امم و مصنف ممالك"

ان کی تصنیفات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر یونان اور یونانی علوم کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ ہمارے ہاں ہندوستان کے بڑے سے بڑے مجددین امت کی کتابیں بھی یونانی گورکھ دھندے اور "اشراقیت" کے اثرات سے یکسر پاک نہ رہ سکیں۔ شیخؒ کا طریقہ بالکل قرآنی ہے اور ان کی دلیلیں۔ جزءً و کلاً، قرآن وحدیث سے ماخوذ ہوتی ہیں۔

دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کی اصطلاحات بھی ناپید ہیں۔ ویدانت اور نوافلاطونی فلسفہ کے اس معجون مرکب نے (جس کا نام لوگوں نے تصوفؔ[1] رکھ چھوڑا ہے) اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کر ڈالیں۔ اسلامی ہند کے مجددین نے یہ بڑی غلطی کی کہ وہ اس افیون کا استعمال کراتے رہے! افیون، بہر حال افیون ہے۔ آپ اس کے لاکھ بدرقے، استعمال کرائے۔ اس کے برے اثرات بہر حال اعضائے رئیسہ کو تباہ کرتے جائیں گے نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان آج تک

---

[1] بعض دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ تصوف کی مخالفت عمومیت کے ساتھ نہ کی جائے۔ بلکہ جیسے "علماء سوء" کے فقرے سے بے عمل علماء کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیۂ سوء کی اصطلاح مکار اور بدعت نواز صوفیوں کے لئے استعمال کی جائے۔ ہمیں اس مشورے کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا' اگر ہمارے سامنے "تصوف" کی تباہ کاریاں نہ ہوتیں۔ باقی وہ جس "احسان" اور اسلامی طریق تزکیہ کی دعوت دیتے ہیں' اس سے کس کافر کو اختلاف ہوگا؟ اختلاف اس غیر ماثور اصطلاح۔ (تصوف) سے ہے جس کے پردے میں دن دھاڑے دجل وفریب کا بازار گرم رہتا ہے۔ اور اس فتنۂ عام سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ اس لباس ہی کو اُتار کر پھینک دیا جائے۔

اس "مایا جال" سے نہ نکل سکے۔ لیکن شیخ الاسلام کے صحیح علاج اور اس افیون سے مکمل پرہیز کے باعث نجد اور نواح نجد کے مسلمان اس گورکھ دھندے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔

جہاں تک شیخ کے طرز بیان کا تعلق ہے، اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ البتہ زبان انشاء امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) ابن قیم (م ۷۵۶ھ) اور شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کی طرح بہت بلند نہیں۔

لیکن ان کی تحریروں میں ایک دوسری انمول چیز ہے، جو پورے اسلامی لٹریچر میں خال خال نظر آتی ہے اور آٹھویں صدی ہجری کے بعد تو بالکل عنقا ہو گئی تھی۔ آپ اجازت دیں، تو ہم اقبالؒ کی زبان میں اسے "نفس" سے تعبیر کریں۔ ان کی ہر سطر تاثیر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاید یہ اس دینی تڑپ کا اثر ہو جس نے انھیں عمر بھر بے قرار رکھا آخر ان میں کوئی چیز تو تھی، جس نے آن کی آن میں نجد اور اس کے نواح کی کایا پلٹ کر دی۔ خلاصہ یہ کہ ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں اور خاص کر رسائل میں یہ تاثیر زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

ہمیں شیخ کی حسب ذیل تالیفات کا علم ہو سکا ہے:

(۱) کتاب التوحید۔ شیخ کی تصنیفات میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس طرح ہندوستان کے خوش فہموں میں مولانا اسماعیل شہید (ش: ۱۲۴۶ھ) کی تقویۃ الایمان بدنام ہے، اسی طرح عرب و عجم کے اکثر خوش عقیدہ لوگوں میں کتاب التوحید بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس کا پورا نام کتاب التوحید الذی ھو حق اللہ علی العباد" ہے۔ اس میں شیخ نے توحید کی حقیقت، اس کے حدود، شرک اور اس کی

خرابیاں، اور اس میں ابتلا کے تمام راستوں (استعاذہ، استغاثہ، توسل، دعا، نذر، ذبح، سحر، کہانت، فال، وغیرہ وغیرہ) کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے، ہر باب کے مطابق قرآن وحدیث کی صاف اور واضح شہادتیں جمع کر دی ہیں۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ بار بار ہزاروں ہزار کی تعداد میں طبع ہوئی، مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے، اردو میں بھی کئی ایک ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی ترجمہ کا اب تک پتہ نہیں چلا[۱]۔

علمائے نجد نے اس پر شرحیں بھی لکھی ہیں، جن میں بعض بہت مفید اور پر مغز ہیں۔ بروکلمن نے دو شرحوں کا ذکر کیا ہے[۲]:-

(الف) الدر النضید لاحمد بن حسن النجدی جو دلی میں طبع ہوئی (۱۳۱۱ھ)۔

---

[۱] انڈیا آفس کی عربی فہرست (۲: صفحہ ۳۸۴: نمبر ۲۰۵۰) میں کتاب التوحید کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا گیا ہے (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی: ۱۸۷۴ء)، حالانکہ وہ ترجمہ شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے اس رسالے کا ہے، جو انھوں نے ۱۲۱۸ھ میں فتح مکہ کے وقت تالیف کیا تھا۔ یہ شبہ بروکلمن کو بھی ہوا تھا (۲: ۳۹)، لیکن ذیل (۲: ۵۳۲) میں اس نے تصحیح کرلی۔ لیکن تصحیح کے بعد بھی سنہ کی غلطی رہ گئی۔ ۱۸۷۴ء کی جگہ ۱۸۴۰ء چھپ گیا ہے۔ شیخ عبداللہ کے رسالہ کا ترجمہ او کنلی (O'Kinely) کے قلم سے ہے اور اس نے عجیب و غریب غلطیاں کی ہیں۔ کسی موقع پر ذکر آئے گا۔

[۲] تاریخ ادب عربی (جرمن): ذیل: ۲: ۲، ۵۳۱۔

(ب) فتح اللہ الحمید المجید مصنفہ حامد بن محمد بن حسن، جوامرتسر میں چھپی (۱۸۹۶ء) پہلی کا ہمیں علم نہیں ہوسکا۔" دوسری شرح ادھوری اور معمولی ہے"۔ لیکن بروکلمن نے سب سے اہم شرح فتح المجید کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اصل میں سلیمان بن عبداللہ بن شیخ الاسلام (مقتول ۱۲۳۳ھ) نے لکھنا شروع کی تھی لیکن نامکمل رہی۔ تکمیل شیخ عبدالرحمٰن بن حسن بن شیخ الاسلام (ف ۱۲۸۵ھ) نے کی، اور کافی اضافے بھی کئے، اور ہمارے سامنے جس شکل میں ہے وہ شیخ ابن حسن ہی کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ اس شرح میں تمام مسئلوں پر سیر حاصل بحث ہے۔ جا بجا امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اور ابن قیم کی کتابوں سے طویل اقتباسات دیئے ہیں۔ اور اس طرح پر یہ شرح ایک جامع اور مفید کتاب ہوگئی ہے۔

یہ پہلے مطبع انصاری، دہلی میں چھپی تھی۔ (۱۳۱۱ھ)۔ دوبارہ مطبعہ سلفیہ، مصر میں بحرین کے مشہور تاجر شیخ عبدالرحمٰن قیصبی کے صرفہ سے معمولی کاغذ پر چھپی۔ (۱۳۴۷ھ) اور مفت تقسیم ہوئی۔

اب تیسری مرتبہ مطبع انصار السنۃ المحمدیہ، قاہرہ میں شیخ محمد حامد الفقی کے اہتمام سے نہایت آب و تاب کے ساتھ چھپی ہے (۱۳۵۷ھ) آغاز میں محمد حامد الفقی نے مصنف کے حالات بھی دیئے ہیں، جو عنوان المجد سے منقول ہیں۔ ناشر نے جا بجا احادیث کی تخریج بھی کی ہے، نیز شرح میں جہاں جہاں امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کے اقوال بلا حوالہ نقل کئے گئے ہیں، وہاں ناشر نے حاشیہ میں اصل کتابوں کا ٹھیک حوالہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے مراجعت میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔

شیخ عبدالرحمٰن بن حسن نے اس مفصل شرح (جو شیخ سلیمان بن عبداللہ کی نامکمل شرح کی تکمیل ہے) کے علاوہ، کتاب التوحید پر کچھ "تعلیقات" کرائے تھے، وہ بھی الگ قرۃ عیون الموحدین کے نام سے چھپ گئے ہیں (مطبع المنار مصر ۱۳۴۶ھ) راقم کی نگاہ سے یہ کتاب نہیں گزری۔ محمد حامد الفقی نے فتح المجید کے حواشی میں کہیں کہیں اس کے اقتباسات دیئے ہیں۔

(۲). کشف الشبہات من التوحید۔ اسے ہم کتاب التوحید کا تکملہ کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو شیخ کی تمام کتابیں توحید سے متعلق ہیں، اور کتاب التوحید کا تتمہ کہی جا سکتی ہیں، لیکن رسالہ "کشف الشبہات" میں توحید ہی توحید ہے۔ عام طور پر لوگوں کو توحید خالص کے متعلق جو شکوک ہوتے ہیں، ان کا ازالہ کیا گیا ہے۔ کسی کو ولی، غوث کا خیال آتا ہے، کوئی "توسل" اور "استغاثہ" کی راہ سے بھٹکتا ہے۔ کہیں "شفاعت" میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس رسالہ میں ان سب شبہات کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ انداز استدلال یکسر قرآنی ہے۔ کہیں ادنیٰ ابہام نہیں، اور نہ متاخرین کے جدلیہ طرز بیان کا کہیں سایہ بھی پڑنے پایا ہے۔ ایک چھوٹا سا رسالہ معلومات اور فوائد کا گنجینہ ہے۔ بار بار چھپ چکا ہے، ہمارے سامنے وہ نسخہ ہے، جو عیسیٰ بن رمیح نجدی کے مجموعہ (ص ۷۶-۵۶) میں چھپا ہے۔

(۳) الاصول الثلاثۃ وادلتہا: معرفت رب[1]، معرفت دین اسلام[2]، معرفت نبی[3]۔ ان تینوں اصولوں کی دلنشین انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ نہایت چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) شروط الصلاۃ وارکانہا: اس مختصر رسالے میں نماز کی شرطوں (اسلام[1]، عقل[2]،

تمیز[۳]، رفع حدث[۴]، ازالت نجاست[۵]، ستر عورۃ[۶]، دخول وقت[۷]، استقبال قبلہ اور نیت[۹] کی توضیح کی گئی ہے۔ نیز نماز کے ارکان اور واجبات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) اربع قواعد: اس رسالہ میں بھی توحید کے بعض پہلو نہایت موثر اور سادہ طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں۔ چار اہم قاعدے یہ ہیں:

(الف) کفار عرب بھی اللہ تعالےٰ کو "خالق، رزاق اور مدبر" مانتے تھے لیکن اس سے وہ "اسلام میں داخل نہ ہو سکے"۔

(ب) کفار عرب بھی، اولیاء من دون اللہ کو 'قربت اور شفاعت' ہی کے لئے پکارتے تھے۔ ویقولون ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللہ۔

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملائکہ، انبیاء، صالحین، اشجار، احجار، شمس، قمر" کی پرستش کرنے والوں سے یکساں قتال کیا اور ان مختلف قسم کے مشرکین کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی۔

(د) اس زمانہ کے مشرک، پہلے مشرکین سے گئے گزرے ہیں۔ وہ تو کم از کم مصیبتوں میں اللہ کو یاد کر لیا کرتے تھے اور موجودہ زمانہ کے مشرک ہر حال میں "اولیاء من دون اللہ" ہی کو پکارتے ہیں۔

اس مختصر رسالے میں انہیں چار 'قواعد' کی آیات قرآنی سے توضیح کی گئی ہے

یہ تینوں رسالے عیسیٰ بن رمیح نجدی کے طبع کرائے ہوئے مجموعہ میں ایک ساتھ چھپے ہیں (ص ۲۷) مطبع المنار، قاہرہ سنہ ۱۳۴۰ھ نیز مجموعۃ الکتاب المفید مطبوعہ مکہ مکرمہ (سنہ ۱۳۴۳ھ) میں بھی یہ رسالے شامل ہیں۔

(۶) اصول الایمان: ایمان کے مختلف ابواب کی احادیث سے تشریح

کی گئی ہے! آغاز کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے بعض فرزندوں نے اصل رسالہ میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ "وقد زاد فیہ بعض اولادہ زیادۃ حسنۃ"۔

پہلے دہلی میں چھپا تھا اب مجموعۃ الحدیث النجدیہ (قاہرہ: مطبع المنار ۱۳۴۲ھ) کے ضمن میں طبع ہوا ہے (صفحہ ۲۴۰-۲۰۹)۔

(۷) کتاب فضل الاسلام: اسلام کے شرائط کی توضیح کے ساتھ ساتھ بدعت و شرک کی برائیاں کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ: ص ۲۵۵-۲۴۲)۔

(۸) کتاب الکبائر: کبائر کے تمام اقسام، الگ الگ ابواب کی صورت میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ہر باب میں قرآن و حدیث کے نصوص سے توثیق کی گئی ہے۔ بلکہ مصنف نے اپنی طرف سے بہت کم لکھا ہے، قرآن کریم اور سنت نبوی کا سلیقہ کے ساتھ جمع کر دینا، اپنی جگہ پر خود ایک کام ہے۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ، ص ۳۱۰-۲۵۸)

(۹) نصیحۃ المسلمین: یہ ایک مستقل کتاب ہے، جس میں اسلامی تعلیم کے تمام شعبوں پر الگ الگ بابوں میں حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ مصنف نے اپنی طرف سے بہت کم بلکہ کچھ نہیں لکھا ہے۔ (مجموعۃ الحدیث ص ۳۱۲-۳۷۸)

(۱۰) ستۃ مواضع من السیرۃ: سیرت طیبہ کے چھ مقامات کی توضیح اور ان کے نکات پر چھوٹا سا رسالہ ہے۔ وہ چھ مقام (ستۃ مواضع) یہ ہیں:

(الف) نزول وحی کی ابتدا۔

(ب) تعلیم توحید اور کفار کا ردیہ۔

(ج) "تلک الغرانیق العلی" کا واقعہ۔

(د) ابوطالب کا خاتمہ۔

(ھ) ہجرت کے منافع اور ان سے سبق۔

(و) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا واقعہ۔

(مجموعۃ الکتاب المفید: ص۲۳-۱۹)

(۱۱) تفسیر الفاتحہ: سورۃ فاتحہ کی نہایت ہی مختصر تفسیر، لیکن اس میں بھی شیخ کا جذبۂ توحید سطر سطر سے نمایاں ہے۔ (مجموعۃ الکتاب المفید: ص۱۹-۱۸)

(۱۲) مسائل الجاہلیۃ: اس رسالہ میں شیخ الاسلام نے ایسے ایک سو اکتیس [۱۳۱] مسئلے بیان کئے ہیں۔ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل جاہلیت اور ان کے معتقدات کی مخالفت کی ہے۔ محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) نے اس کی شرح بھی لکھی ہے (الزہر اسا ص۵۲-۴۰)

(۱۳) تفسیر الشہادۃ: کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر جس میں توحید کی اہمیت دلنشین انداز میں واضح کی گئی ہے۔ (〃: ص۸۰-۷۸)

(۱۴) التفسیر علی بعض سور القرآن[۱]: مختلف آیتوں اور سورتوں پر شیخ الاسلام کی تعلیقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک ایک آیت سے بیسیوں مسئلے استنباط کرتے جاتے ہیں۔ یہی اس کی خاص خصوصیت ہے۔

(۱۵) کتاب السیرۃ: یہ سیرت ابن ہشام کا خلاصہ ہے۔ پٹنہ لائبریری میں اس کا ایک بہت اچھا اور قدیم نسخہ ہے[۲]۔

(۱۶) الہدی النبوی: امام ابن القیم کی زاد المعاد کا مختصر۔ کتاب کے اوپر صرف مختصر

---

[۱] فہرست مشروح اورینٹل لائبریری، پٹنہ: ج ۱۸/ ۲: ع ۱۴۷۷

[۲] فہرست مشروح: جلد ۱۵ ع ۱۰۳۸/ ۱۔

"الہدی النبوی" لکھا ہوا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ[1] لائبریری میں ہے۔

ان کے علاوہ شیخ کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے ہیں، جن کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بعض رسالے روضۃ اور اسی طرح بعض استفسارات کے جوابات بھی روضۃ الافکار میں درج[2] ہیں۔

---

[1] فہرست مشروح: جلد ۱۵ ع ۱۰۳۸/۲۔

[2] جلد اول، فصل ثالث و رابع

چوتھا باب

(۴)

دعوت

سیاست کی کارفرمائی مصر جدید کے مشہور مصلح عالم اور سید جمال الدین افغانی کے رفیق خاص شیخ محمد عبدہ (ف ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) "سیاست" اور اس کی "بے انصافیوں" سے پناہ مانگتے تھے: "ما دخلت السیاسة فی شیٔ الا افسدته" ان کا مشہور فقرہ ہے، اور ایک حد تک یہ سچ بھی ہے۔ مقصد برآری کے لئے ارباب سیاست، جائز اور ناجائز کا خیال نہیں کرتے اور اس لئے صداقتوں کے مسخ کرنے میں وہ عارضی طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام کی دعوت، جسے 'وہابیت' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کتاب و سنت کی صحیح تعلیم کے سوا وہ اور کچھ نہیں پیش کرتے، لیکن سیاسی اغراض کے ماتحت، شیخ کی دعوت کو 'وہابیت' کا نام دے کر اس طرح پیش کیا گیا جیسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی دعوت دی جا رہی ہو۔

سوء اتفاق سے اہل نجد کے بدنام کرنے میں تین جماعتیں شریک ہو گئیں ترکی اور مصری حکومتوں سے تو براہ راست ٹکر تھی، اور جنگ و پیکار کا سلسلہ ایک عرصہ تک

جاری رہا۔ ایک دو ٹکر ہو گئی تھی۔ اس لئے تینوں حکومتوں (حکومت ہند بھی) اور ان کے وظیفہ خواروں نے اس "کارِ خیر" میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے علاوہ اشراف مکہ اور ان کے حواری اپنے نذر و نیاز کی آمدنیوں کی بندش پر الگ برہم تھے[۱]، نیز عام یورپی سیاح (انگریزوں کے علاوہ بھی) جزیرۃ العرب میں صحیح مذہبی بیداری کو اچھی آنکھوں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مختلف اسباب کے ماتحت، مختلف حکومتوں اور جماعتوں نے شیخ کی دعوت کی برائی اور بدنامی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک "وہابیت" نے ایک "ہوے" کی شکل اختیار کر لی تھی پھر ہندوستان میں حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ دہلوی کی تحریک تجدید و امامت کو "وہابیت" کا نام دے کر، اسے اسلام سے الگ ایک خارجی

---

[۱] مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قرون اور قیوں کی آمدنیوں پر ایک بڑی جماعت کا گزارا تھا۔ ۱۲۱۸ھ میں، سعودی قبضہ کے بعد ان کی روزی بند ہو گئی، تو یہ دعوت کے مخالف بن گئے اور دور و نزدیک طرح طرح کی غلط بیانیاں کرنے لگے۔ جبرتی (۳: ۲۵۵) صفر ۱۲۱۸ھ کے 'حوادث' میں لکھتا ہے:

"حاجیوں کے ساتھ، اہل مکہ کی بڑی تعداد وہابیوں کے خوف سے بھاگ کر آئی ہے۔ لوگ "وہابی" کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، بعض اسے "خارجی" اور کافر بتاتے ہیں۔ یہ رائے اہل مکہ اور ان کے پیرووں کی ہے اور بعض، بے غرضی کے وجہ سے، ان کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔" الخ الخ۔

قسم کے مذہب[1] کی حیثیت دے دی گئی۔

آج سے تیس چالیس برس پہلے عام غلط الزامات کے قبول کرنے کی کوئی توجیہ کی جا سکتی تھی۔ اہل نجد کی کتابیں عام طور پر نہیں ملتی تھیں، اور خود علماء نجد اپنے محدود علاقہ سے باہر تبلیغ واشاعت پر بہت کم توجہ کرتے تھے۔ اس لئے اس وقت یہ بہت ممکن تھا، کہ کوئی شخص سچائی کے ساتھ ان کے متعلق غلط رائے رکھتا ہو۔ لیکن، آج کہ شیخؒ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات چھپ کر عام ہو چکی ہیں، لاعلمی کا عذر مسموع نہیں ہو سکتا۔

شیخ کا فقہی مسلک مختصر طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ الاسلام، دین کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، عقائد و اعمال، ہر چیز میں سلف کی پیروی ان کے دل سے لگ گئی تھی۔ فروع فقہ میں وہ امام اہل سنت احمد بن حنبلؒ (ف سنہ ۲۴۱ھ) کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ لیکن حنابلہ کے مسلک کے خلاف کوئی حدیث مل جانے پر انہیں کوئی طاقت اس حدیث پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی:

واما مذهبنا فمذهب الامام احمد بن حنبل امام اهل السنة في الفروع، ولا ندعي الاجتهاد واذا بانت لنا سنة صحيحة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم عملنا بها، ولا نقدم عليها قول احد كائنا من كان[2]

ہمارا مذہب فروع اور احکام میں امام اہل سنت، امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے اور ہم اجتہاد کا دعوے نہیں کرتے۔ اور جب رسول اللہ کی کوئی صحیح سنت ہم پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور اس پر کسی کا (خواہ کوئی بھی ہو) قول مقدم نہیں کرتے۔

---

[1] مذہب: یہاں عربی مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں هو ما ذهب اليه احد الائمة اردو میں مذہب، دین کا مرادف ہو گیا ہے۔

[2] الهدية السنية: ص ۹۹

امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کے اقوال سے وہ بسا اوقات استدلال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تقلید کا پھندا بھی شیخؒ نے گردن میں نہیں ڈالا۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اسی وقت تک ان کے پیش رو ہیں، جب تک ان کے علم کے مطابق وہ کتاب و سنت سے منحرف نہیں ہوتے، بلکہ وہ امام یا عالم ان کی نگاہ میں صرف اس لئے محبوب ہے کہ وہ کتاب و سنت پر صحیح صحیح عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

الامام ابن القیم وشیخہ اماما حق من اھل السنۃ وکتبھم عندنا من اعز الکتب الا انا غیر مقلدین لھم فی کل مسئلۃ[1]	امام ابن القیم اور ان کے استاد دونوں اہل سنت کے ائمہ حق میں سے ہیں اور ان کی کتابیں ہمیں بہت محبوب ہیں مگر یہ کہ ہر مسئلہ میں ہم ان کے مقلد نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، وہ حنبلی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے بھی، دوسروں کو اس کی پیروی پر مجبور نہیں کرتے۔ وہ شافعی کو شافعی اور حنفی کو حنفی بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ بدعات اور بیہودہ رسمیں کسی امام نے روا نہیں رکھیں۔ غنا اور مزامیر کے بارے میں فقہائے حنفیہ سے کون زیادہ سخت ہے؟ لیکن آج ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے کو "حنفی" کہنے والے کیا کیا نہیں کر رہے ہیں؟

شیخؒ کے فقہی مسلک کی مزید توضیح کے لئے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

ونحن ایضا فی الفروع علی مذھب الامام احمد بن حنبل ولا ننکر علی من قلد احد الاربعۃ دون الغیر لعدم ضبط مذاھب الغیر کالرافضۃ الخ۔

(ہم بھی فروع میں امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب[2] پر ہیں، اور ائمہ اربعہ کے

---

[1] الہدیۃ السنیۃ: ص۵۳

[2] مدگو یوتھ نے شیخ الاسلام اور امام احمد بن حنبلؒ کے اختلافات کی ایک فہرست (باقی حاشیہ ص۱۳۴ پر)

مقلدین پر نکیر نہیں کرتے۔ البتہ ان کے علاوہ دوسروں کی تقلید روا نہیں رکھتے، اس لئے کہ اوروں کے مذاہب صحیح طور پر مدون نہیں، جیسے روافض وغیرہم)۔

ولا نستحق الاجتهاد المطلق ولا احد لدينا يدعيها الا اننا في بعض المسائل اذا صح لنا نص جلي من كتاب او سنة غير منسوخ ولا مخصص ولا معارض باقوى منه وقال به احد الائمة الاربعة اخذنا به وتركنا المذهب كارث الجد والاخوة فانا نقدم الجد و ان خالف مذهب الحنابلة۔[۵۱]

اور ہم "اجتہاد مطلق" کے اہل نہیں، اور نہ ہم میں سے کوئی اس امر کا دعوےٰ کرتا ہے۔ مگر یہ کہ بعض مسائل میں اگر کتاب یا سنت کی کوئی غیر منسوخ واضح نص سامنے آجائے، جس کی تخصیص یا تعارض بھی کسی دوسرے قوی نص سے نہ ہو اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اسے اختیار کیا ہو، تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں، جیسے جد اور بھائیوں (اخوۃ) کے ترکہ میں ہم حنابلہ کے مسلک کے خلاف، جد کو "اخوۃ" پر مقدم رکھتے ہیں۔

عقائد عقائد کے باب میں وہ "سلف" کے مسلک پر ہیں۔ قرآن کریم اور صحیح حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفتیں آئی ہیں، انھیں ہو بہو تسلیم کرنا اور "کیفیت" کی نفی کے ساتھ ان کے "ظاہر" پر ایمان لانا، یہی سلف کا مسلک ہے،

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۳) دی ہے، جو انتہائی جاہلانہ ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتا ہے کہ نماز باجماعت شیخ کے نزدیک فرض (Obligatory) ہے اور امام کے ہاں نہیں۔ اس سے زیادہ جہل کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ (مقالۂ وہابیت: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)۔

۵۱. بحوالہ تاریخ نجد للآلوسی: ص۴۶-۴۵؛ صیانۃ الانسان: ص۴۷۱

صفات کا مسئلہ علماء اسلام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ ایک جماعت "تشبیہ" اور "تمثیل" کے خوف سے "صفات" ہی کا انکار کر بیٹھی۔ یہ گویا اللہ کو معطل کر دینا ہوا۔ دوسری جماعت "صفات" کی قائل ہوئی، تو "تشبیہ" اور "تکییف" کی حد تک آگئی۔ یہ بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات "جسمیت" سے منزہ ہے۔ متکلمین اشاعرہ نے اس "تعطل" اور "تشبیہ" سے بچنے کے لئے ان تمام آیتوں اور حدیثوں کی تاویل شروع کر دی۔ وہ "استوا" سے "استیلا" مراد لینے لگے۔ اسی طرح (ید اللہ) کی تفسیر "نعمت" اور "قدرت" سے کرنے لگے۔ (فانک باعیننا) سے حفظ و نگہداشت کے معنی لئے گئے الخ۔ لیکن "سلف" اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے اس تاویل سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ سے جو آپ مراد لے رہے ہیں، وہی مراد الٰہی بھی ہے؟ اور پھر تاویل کرنے والوں کو بعض آیتوں اور حدیثوں کی تاویل میں ایسی دور از کار تاویلیں کرنا پڑتی ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ابن فورک (م ۴۰۶ھ) کی "مشکل الحدیث" میں اس "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔

سلف کا مسلک اس "تکییف" و تعطیل اور تاویل سے الگ ہے۔ ائمہ سلف کا مسلک امام ابن تیمیہؒ کی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

"ائمہ سلف کا مذہب یہ ہے کہ ہم اللہ کو تحریف، تعطیل، تکییف، تمثیل کا ادنیٰ شائبہ آئے ہوئے بغیر ان صفتوں کے ساتھ متصف کریں، جن کے ساتھ خود اس نے اپنے کو اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متصف کیا ہے۔ تو ان صفات کی نفی جائز نہیں، جن سے اس نے اپنے کو متصف کیا ہے، اور نہ ان صفات کو مخلوق کی صفتوں کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس کی

ذات ان چیزوں سے منزہ ہے۔ اس کا مثل کوئی نہیں۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں۔ تو سلف کا مذہب، دو مذہبوں کے بین بین اور دو گمراہیوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔ یعنی صفات کا اثبات اور مخلوقات کے ساتھ مماثلت کی نفی[1] الخ الخ

تو گویا سلف کا مسلک اثبات اور نفی کے درمیان ہوا۔ وہ ید، عین اور اس قسم کی دوسری صفتوں کی تاویل نہیں کرتے، بلکہ ان کے ظاہر ہی پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن مماثلت کی نفی کے ساتھ "ید" اور "عین" سے صفات باری میں وہ معنی نہیں سمجھے جائیں گے، جو انسانوں کے ساتھ سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالے کیف اور تجسیم سے منزہ ہے۔ اصل مفہوم اور کیف کا علم صرف اللہ تعالے کو ہے۔ ہمارا کام بے چون وچرا ایمان لانا ہے۔ امام دارالہجرۃ، مالک ابن انس کا مشہور مقولہ مسلک سلف کی بہترین ترجمان ہے:

الاستواء غیر مجھول والکیف غیر معقول والایمان بہ واجب والسؤال عنہ بدعۃ۔	استواء نامعلوم نہیں، اور کیف کا تصور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق کریدنا بدعت ہے۔[2]

یہ سلف کا مسلک صرف حنابلہ یا امام ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کا نہیں، بلکہ تمام ائمہ اسلام کا یہی مسلک رہا ہے۔ "تشبیہ اور تجسیم کی نفی کے ساتھ تاویل سے بچنا" (الامساک عن التاویل مطلقاً مع نفی التشبیہ والتجسیم) تمام ائمہ

---

[1] الانتقاد الرجیح (علی حاشیۃ جلاء العینین) صد ۲۰۳۔

[2] جلاء العینین: صد ۲۱۲

کا مسلک رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، محمد بن الحسن، سعد بن معاذ مروزی، عبداللہ بن المبارک، سفیان ثوری، امام بخاری، ترمذی، ابو داؤد سجستانی وغیرہم سب اسی مسلک پر گامزن رہے ہیں۔[۱]

خود امام ابو الحسن اشعری سے رجوع ثابت ہے۔ امام الحرمین سے بھی اس کی تائید منقول ہے۔ تمام صحابہ اور تابعین کا تو یہ مسلک تھا ہی، تاویل کا دروازہ تو "عقلیت" کی گرم بازاری کے بعد کھلا۔

متاخرین اشاعرہ اور عام علمائے اسلام (متاخرین) کا مسلک 'تاویل' کا رہا ہے۔ مدرسوں میں 'عقائد' کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے' وہ بھی اہل تاویل کا مسلک ہے۔ لیکن تاویل کے وہ معنی تو ان الفاظ کا ایک محمل ہے' ایسی بیسیوں تاویلیں اور بھی کی جا سکتی ہیں۔ یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ آپ کی تاویل عین مراد الٰہی کے مطابق ہے اور اگر اس کا یقین نہیں (اور یقینی نہیں) تو ہم پھر اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈالیں؟ سلامتی اسی میں ہے کہ اسلاف کے طریقہ کے مطابق ہم بھی (کلماتِ وارد فی الشرع) پر بلا 'تعطیل' و 'تکییف' کے اعتقاد رکھیں۔ یہی پہلے بزرگوں کا مسلک ہے اور اسی پر آج بھی ٹھیٹھ اہل توحید و سنت اعتقاد رکھتے ہیں۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور ان کے پیروؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے:

"...... وبالجملة فعقيدتنا في جميع الصفات الثابتة في الكتاب	خلاصہ یہ کہ ان تمام 'صفات' کے بارے میں جو کتاب و سنت میں ثابت ہیں، ہمارا عقیدہ

[۱] جلاء العینین: ص ۲۲۹

والسنة عقيدة اهل السنة والجماعة نؤمن بها ونمرّ بها كما جاءت مع اثبات حقائقها وما دلت عليه من غير تكييف ولا تمثيل ومن غير تعطيل ولا تبديل ولا تاويل الخ[1]

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کے معانی اور حقائق پر اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن کبھی تکییف تمثیل، یا تعطیل و تبدیل اور تاویل کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیتے۔ الخ

آیات صفات کے باب میں "سلف" کا مسلک مشہور ہے (جس کی مختصر توضیح اوپر کی گئی) صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شیخ الاسلام بھی "سلف" کا عقیدہ رکھتے تھے۔ قرون اولیٰ کے بعد امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) سے زیادہ کسی نے اس سلسلہ میں تکلیفیں نہیں اُٹھائیں۔ اشاعرہ اور متکلمین کے خیالات ذہن اور دماغ پر کچھ اس طرح مسلط ہو گئے تھے کہ راہ حق بھی لوگوں کو جاہلوں اور کم عقلوں کا مسلک نظر آتی تھی۔

بہرحال امام ابن تیمیہ کی طرح شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب بھی "سلف" کے عقیدے پر سختی کے ساتھ قائم رہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے آلوسی کی جلاء العینین[2] فی محاکمۃ الاحمدین ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جہاں فاضل مصنف نے پوری بحث کا نچوڑ دے دیا ہے۔ ابن تیمیہ، ابن جوزی (ف ۶۴۲ھ) شیخ عبدالقادر جیلی اور خود امام ابوالحسن اشعری (ف تقریباً ۳۳۴ھ) کی تصنیفات سے اقتباسات دیئے ہیں۔

توحید اور اس کے لوازم شیخ نے اپنی تمام کتابوں اور رسائل میں توحید پر بہت زور دیا ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ انکی تصنیفات میں صرف توحید ہی توحید ہے۔ ان کی دعوت بھی توحید کی تھی، شعار کلمہ لا الٰہ الا اللہ تھا۔ وہ ہر ایک کو اسی کلمہ کا مفہوم سمجھاتے

---

[1] الهدية السنية: ص ۹۹ ۵۲ ص ۲۶ - ص ۱۶۱

اور اس کی حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ اسی لئے ان کے ماننے والے بسا اوقات 'موحدین' کے نام سے بھی پکارے جاتے ہیں۔

'توحید' کیا ہے؟ صرف اللہ تعالٰے کو عبادت کا مستحق قرار دینا۔ بات معمولی سی ہے، لیکن شیطان کی گھاتیں بہت وسیع ہیں۔ اس نے ایک اللہ کے پرستاروں سے بھی وہ کام کرائے، جو شرک کے حدود میں داخل ہوتے ہیں۔ 'اخلاص توحید' کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام اعمال و اقوال سے پرہیز کیا جائے، جن میں غیر اللہ کی شرکت کا ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ شیخ الاسلام نے ان 'اعمال و اقوال' کی توضیح میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان کے مضرات اور برائیاں کھول کھول کر بیان کیں، جن راہوں سے یہ برائیاں پیدا ہوتی تھیں۔ ان کے رد کئے کی کوششیں کیں۔ لیکن وہ قوم جو سارے عالم کے لئے توحید کا پیغام لے کر نکلی تھی، بعد کی صدیوں میں خود قبر پرستی، تعزیہ پرستی اور اس قسم کی دوسری "پرستیوں" کا اس طرح شکار ہوئی، کہ جب ایک عرصہ کے بعد اس کے کانوں میں توحید کی آواز پہنچی، تو اسے اجنبیت محسوس ہونے لگی۔ کتاب و سنت سے نصوص پیش کئے گئے، تو تاویلیں کی گئیں اور خود توحید کے علم برداروں کو 'وہابی'، 'مشرک'، 'خارجی' اور مختلف فقہی اور مذہبی گالیوں سے نوازا گیا۔ شیخ الاسلام کا سارا قصور یہ ہے کہ انہوں نے کھلم کھلا توحید کی دعوت دی۔ شرک اور اس کی آلودگیوں سے بچنے کی تاکید کی اوثان من دون اللہ کی مذمت کی۔ غیر اللہ کی قسمیں کھانا، نذریں ماننا اور قبروں کی پرستش کی صاف صاف برائی کی۔ اور اگر یہ واقعی قصور ہے، تو پھر ہر مسلمان کو سچے دل سے قصوروار بن جانا چاہیئے۔

ذیل میں ہم ان مخصوص باتوں کو سادہ لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں، جو شیخ

اور اہل سنت کی رائے اور عقیدہ میں توحید سے دور اور شرک سے قریب کرنے والی ہیں:۔

(۱) مصیبتوں میں غیر اللہ کو پکارنا یا اللہ کے ساتھ غیر کو بھی پکارنا: اب جو عام طور پر کم لکھے پڑھے یا پڑھے لکھے خوش عقیدہ "یا رفاعی" "یا بدوی" اور "یا عبد القادر" (اور ہمارے ہاں: اے داتا پیر بھوڑ، اے مخدوم صاحب، اے مخدوم منجھن وغیرہ وغیرہ) کہہ کر غیر اللہ کو مصیبتوں میں یاد کرتے ہیں، تو یہ "دعاء غیر اللہ" شائبہ شرک سے خالی نہیں۔ اس "دعا" میں عبادت کی جھلک آتی ہے۔ "داعی" کی نیت اور "مدعو" کے مرتبہ سے بالکل بحث نہیں۔ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ "داعی" کی نیت "عبادت" یا "شرک" کی نہ ہو۔ لیکن ایک مخلوق، دوسرے مخلوق کو مصیبتوں میں پکارے، اس سے "دفع ضرر" یا "جلب خیر" کی درخواست کرے، یہ توحید کے سراسر خلاف ہے اور اسلام جیسے دین کامل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں۔

ان حالات میں جو غیر اللہ کو مصیبتوں میں یاد کرتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں "یا" تو وہ جاہل ہے، اور کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات کا اسے علم نہیں، تو اسے شیخ الاسلام کے پیرو سیدھی راہ بتانے کی کوشش کریں گے۔ کہ وہ آئندہ اس سے پرہیز کرے، اور اگر کوئی شریعت کا حکم جاننے کے بعد بھی "دفع ضرر" یا "جلب خیر" کے لئے غیر اللہ کو یاد کرتا ہے اور پکارتا ہے، تو پھر وہ اسے مشرک سمجھتے ہیں، اور اس سے کسی قسم کی رواداری برتنے کے لئے تیار نہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیتیں ان کے لئے حجت اور دلیل راہ ہیں:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ

مِنْ قِطْمِيْرٍ ۔ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ

وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ (۳۵: ۱۴، ۱۵)

(۲) استغاثہ: غیر اللہ سے فریاد چاہنا، اس کا حکم بھی دعاء غیر اللہ کا ہے۔

ابو یزید بسطامی کا قول ہے[1]: استغاثۃ المخلوق بالمخلوق کاستغاثۃ المسجون بالمسجون۔

مخلوق کا مخلوق سے فریاد چاہنا، اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک قیدی دوسرے قیدی سے فریاد طلب کرے۔

طبرانی کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:۔

"انہ لا یستغاث بی، وانما یستغاث باللہ تعالیٰ[2]

(مجھ سے فریاد نہیں طلب کی جاتی، فریاد تو صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے")

خلاصہ یہ ہے کہ "زندہ یا مردہ" کسی غیر اللہ سے فریاد چاہنا قطعاً حرام ہے اور اسلامی توحید کے بالکل خلاف ہے۔

(۳) توسل: لفظ توسل، تین معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے:

(الف) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وسیلہ، تو یہ فرض ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء اور شفاعت کا وسیلہ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور پھر قیامت کے دن اس کا موقع ہوگا، جب

---

[1] جلاء العینین: ص ۲۱۴

[2] بحوالہ جلاء العینین ص ۲۱۳

خلقت رسول کی شفاعت کا وسیلہ ڈھونڈھے گی۔

(ج) تیسرا وہ توسل ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کو انبیاء اور صالحین کی ذات کا واسطہ دلایا جاتا ہے تو یہ صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا نہ وفات کے بعد استسقاء وغیرہ کے موقع پر، نہ قبر پر اور نہ قبر سے ہٹ کر، کسی موقع پر صحابہ سے اس قسم کا غیر مشروع توسل منقول نہیں، جس میں اللہ تعالےٰ کو گویا رسول یا ولی کی ذات کی قسم دی جاتی ہے۔ ادعیہ ماثورہ میں بھی کہیں اس "توسل" کا پتہ نہیں چلتا" توسل کی یہی تین صورتیں ہیں، جن میں سے پہلی صورت (یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی اطاعت کا وسیلہ پکڑنا) ہمیشہ مشروع ہے۔ دوسری صورت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء اور شفاعت کو (ذات کو نہیں) وسیلہ بنانا تو یہ رسول اللہ صلی اللہ کی زندگی میں بلاشبہ "نافع" اور "مطلوب" تھا" "توسل کے ان دونوں معنوں کا منکر کافر اور مرتد ہے" (من انکر التوسل باحدھذین فھو کافر مرتد) جیساکہ امام ابن تیمیہؒ نے تصریح کی ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ دوسری صورت بھی متعذر ہو گئی قبروں پر سلام اور اہل قبر سے مخاطب ہو کر السلام علیکم کہنا منقول ہے لیکن مردہ یا غائب سے دعا کی درخواست کرنا بدعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا (اور کسی نے نکیر نہیں کی)[۲]

اللھم انا کنا اذا اجدبنا توسلنا الیک بنبینا فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا۔	اے اللہ، جب ہم پر قحط سالی آتی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پکڑتے تھے، اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا اور (اب) ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو ہمیں سیراب کر

---

[۱] جلاء العینین: ص ۲۸۴ [۲] مشکوٰۃ المصابیح: باب الاستسقاء۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت عباسؓ کا وسیلہ پکڑنا بے معنی بات نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ "توسل" طلب دعاء کے لئے ہوتا ہے اور وفات کے بعد طلب دعاء متعذر ہے، اس لئے حضرت فاروقؓ عم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وسیلہ لائے۔ (یعنی طلب دعاء کے لئے)

اب رہی تیسری صورت جس میں انبیاء اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کو اولیاء اور صالحین کے نام کی قسم دی جائے، جیسے کوئی کہے۔

اسالك بجاه عبدك او بحرمته

تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حنابلہ کے نزدیک صحیح روایت میں مکروہ تحریمی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہاء حنفیہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ انبیاء، اولیاء، مقامات مقدسہ کسی کے "حق" کا واسطہ دلاکر دعاء مانگنا حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے لاحق للمخلوق علے الخالق سے ان کا استدلال ہے اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہی امام تیمیہؒ کا مسلک ہے۔ اور اسی پر شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین کا عمل ہے، وہ کسی نبی یا ولی کی ذات کے ساتھ "توسل" کو روا نہیں رکھتے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں، تو کوئی نئی بات نہیں کرتے۔ صرف حنفیہ اور حنابلہ کے متفقہ مسلک کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

متقدمین محقق علماء میں شیخ عزالدین بن عبدالسلام (ف سنہ ۶۶۰ھ) صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے توسل کو جائز قرار دیتے ہیں[1]، یعنی ان کے نزدیک "اللھم انی اتوسل الیك بنبیك وحبیبك محمد صلے اللہ علیہ وسلم

---

[1] وہ بھی "ان صح الحدیث فیہ" کی شرط کے ساتھ (الدر النضیۃ: ص ۶)۔

یا " اللّٰھم انی اسئلک بجاہ صفیک ونبیک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا جائز ہے۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات اقدس اور ان کے بلند مرتبہ کو سامنے رکھتے ہوئے شیخ عز الدین بن عبد السلام جیسے مجتہد النظر عالم تک کا ڈگمگا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ متاخرین میں شوکانی (ف سنہ ۱۲۵۰ھ) بھی "توسل بالنبی" کو جائز رکھتے ہیں۔ رہا اولیاء اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنانا، تو یہ کسی سے منقول نہیں ہے اور اگر بعض متاخرین علماء[1] نے اس کے جواز کی کوشش کی ہے، تو یہ ایک بے اصل اور مشتبہ بات کے رائج کرنے کی کوشش ہے۔ اور اس سے خواہ مخواہ بدعات کا دروازہ کھلتا ہے۔

یہاں صرف شیخ الاسلام کے مسلک کی توضیح مقصود ہے۔ کسی فقہی بحث کا یہ موقع نہیں۔ مآخذ کے ضمن میں موضوع کی مختلف کتابوں کا ذکر آئے گا۔ "التوسل والوسیلۃ" کے علاوہ امام ابن تیمیہ کے فتاوی اور دوسری تصنیفات بھی ان بحثوں سے بھری پڑی ہیں۔ مختصر طور پر موافق و مخالف بحثوں کے خلاصہ کے لئے: جلاء العینین (صفحہ ۳۱۵ - ۳۶۹) سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

(۴) استعاذہ: توحید کا اقتضاء یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اسماء اور صفات کے سوا کسی مخلوق کی پناہ بھی نہ ڈھونڈھی جائے۔ اسی اصل کی بنا پر امام اہل سنت احمد بن حنبل نے "قرآن کے کلام الٰہی اور غیر مخلوق (کلام اللہ غیر مخلوق) ہونے" پر اس حدیث سے استدلال کیا تھا:

---

[1] ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہید (ش سنہ ۱۲۴۶ھ) اور اکثر علمائے دیوبند اولیاء اور صالحین کی ذات سے توسل کو جائز کہتے ہیں۔ لیکن راقم کا ذہن اس کے قبول کرنے سے ابا کرتا ہے۔

اعوذ بکلمات اللہ التامات

یعنی اگر اللہ کا کلام مخلوق ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمات اللہ یعنی مخلوق کی پناہ نہ مانگتے۔ گویا اس وقت یہ بات مسلم تھی کہ مخلوق کے ساتھ استعاذہ (یعنی کسی مخلوق کی پناہ مانگنا) جائز نہیں، ورنہ مخالفین ضرور تردید کرتے۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے کاہنوں کی مذمت کی ہے کہ وہ غیر اللہ (جن) کی پناہ مانگتے ہیں۔

اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ
مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًاۙ
(۷۲:۶)

اسی لئے شیخ الاسلام نے صاحب 'بردہ' کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے،

یا اکرم الخلق مالی من الوذبہ سواک عند حلول الحادث الجسم

کوئی شک نہیں کہ "مالی من الوذبہ سوالک" (میرے لئے تیرے سوا کوئی نہیں، جس کی پناہ لوں) صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہو سکتی ہے۔ شوکانی نے بھی (جو 'توسل' کے مسئلے میں نرم ہیں) اس شعر پر اعتراض کیا ہے[1]۔

(۵) الحلف بغیر اللہ: غیر اللہ کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے۔ یہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں، بلکہ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے لیکن عوام بلکہ بعض خواص بھی اس آزار میں مبتلا ہیں، اور تمام مسلم علاقوں میں انبیاء اور اولیاء کی قسمیں کھانے کا عام رواج ہے، اتنا عام کہ اگر آپ کسی کو منع کریں، تو ماننے کے بدلے الٹا آپ پر بددینی یا کم از کم 'وہابیت' کا الزام تو لگا ہی دے گا۔ حالانکہ ترمذی کی روایت (من حلف بغیر اللہ فقد اشرک) میں حلف بغیر اللہ کو 'شرک' کہا گیا ہے۔ اس سے زیادہ 'نہی'

[1] الدر النضید: ص ۲۹

اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی اصل کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا:

لا ینبغی لاحد ان یدعو اللّٰہ الا بہ، واکرہ ان یقول

بمعاقد العز من عرشک او بحق خلقک۔

تو امام اعظم کے نزدیک اللہ کے سوا غیر اللہ کی قسم کھانا یا اس کی دہائی دینا قطعاً ممنوع ہے۔ البتہ امام ابو یوسف بمعاقد العز من عرشک جائز رکھتے ہیں، کہ عرش پر عزت کی جگہ، کا مالک اللہ ہی ہے۔ اور معقد العز من عرشک سے اللہ تعالیٰ ہی مراد ہو سکتا ہے۔ امام صاحب اس کو بھی مکروہ سمجھتے ہیں۔ "بحق فلاں" کہہ کر اللہ سے مانگنا تو بہرحال سب کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ——— دعاء غیر اللہ، استغاثہ بغیر اللہ، التوسل بالانبیاء والصالحین، استعاذۃ اور حلف بغیر اللہ، یہ سب کی سب ایک قسم کی چیزیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اندر شرک، کے جراثیم رکھتی ہے، اور توحید کی روح کے یکسر خلاف۔ اس لئے یہ توہم پرستیاں دین خالص میں کبھی روا نہیں رکھی جا سکتیں۔ محمدؒ بن عبد الوہاب کا قصور صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے ان "مکروہات" سے سختی کے ساتھ روکا، اور کم از کم ایک خطہ میں عوام تک کو اس کا پابند کر چھوڑا۔

(۶) زیارۃ القبور: قبروں کی زیارت مشروع ہونے میں شک نہیں، بشرطیکہ زیارت، کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مسلمان کے لئے انبیاء، صالحین، عام مسلمانوں، بلکہ غیر مسلموں کی قبروں کی زیارت بھی جائز ہے، اُس کے لئے جو 'عبرت اور نصیحت' حاصل کرنا چاہے، اور مسلمانوں کی قبروں کی زیارت سنت ہے (جس کی ترغیب بھی دی گئی ہے)، اُس کے لئے جو اہل قبر کے لئے دعا کرنا چاہے۔

محمدؒ بن عبد الوہاب اور ان کے ماننے والے 'زیارت قبور' کے منکر نہیں، البتہ وہ

ان 'بدعات' کے سخت مخالف ہیں، جو قبروں کے پاس روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ "قبروں سے مرادیں مانگنے والوں، دعا کرانے والوں اور شفاعت چاہنے والوں" کو روکتے ہیں اور آج کل قبروں کی زیارت نہیں ہوتی، بلکہ "بدعت فروشی" کی دوکانیں گرم ہوتی ہیں۔ 'صاحب قبر سے دعا مانگنا' اس کے واسطہ سے دعا مانگنا' یا قبر کے پاس بہ نیت تقرب الی اللہ کھڑے ہو کر اپنے لئے دعا مانگنا۔ ان میں سے کوئی چیز جائز نہیں۔ اور موحدین انہیں چیزوں سے روکتے ہیں۔

"قبروں کے مسجد بنانے" سے حدیثوں میں بار بار منع کیا گیا ہے۔ اس باب میں بے شمار صحیح مشہور حدیثیں ہیں، اور اسی بناء پر محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں نے قبوں کے گرانے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ ایک چیز ناروا ہے۔ فرمان شریعت کے خلاف قبروں کو اوثان (بتوں) کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یہ ایک 'منکر' ہے، اگر طاقت ہو، تو اس 'منکر' کے مٹانے میں دریغ نہیں ہونا چاہیئے۔

محمد بن عبدالوہاب کے جانشین پہلے فرماں روا نہیں، جنہوں نے قبوں کے انہدام پر توجہ کی ہو، بلکہ یہ امام شافعیؒ (۱۵۰ھ - ۲۰۴ھ) ہی کے زمانہ (دوسری صدی ہجری کا آخر) سے چلا آتا ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں ذکر کیا ہے کہ "حکام قبروں کو ہدم کرتے تھے، اور فقہاء ان پر اعتراض نہیں کرتے"۔ نووی نے شرح 'مسلم' میں بھی ان کا یہ قول نقل کیا ہے[۱]۔

اسی طرح ابن حجر ھیثمی کی الزواجر میں بھی منقول ہے۔ ابن حجر نے فقہاء کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

---

[۱] الھدیۃ السنیۃ: حاشیہ از علامہ سید رشید رضا (ف ۱۳۵۳ھ): ص ۹۹

وتجب المبادرة لهدمها وهدم القباب

التي على القبور اذ هي اضر من مسجد الضرار الخ

(ان) قبروں کو اور ان قبوں کو جو قبروں پر (تعمیر کئے گئے) ہیں، فوراً ہدم کر دینا چاہیئے

اس لئے کہ یہ "مسجد ضرار" سے بھی زیادہ خطرناک ہیں[1]

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات آئینہ ہو گئی، کہ شیخ الاسلام محمدؒ بن عبدالوہاب کس

دین کی دعوت نہیں دیتے، نہ انہوں نے کوئی نیا فقہی مذہب ہی ایجاد کیا ہے

خود امام احمدؒ بن حنبل کے مذہب پر ہیں (ف ۲۴۱ھ) ان کی دعوت صرف دکتاب

وسنت، کی دعوت ہے۔ وہ حنفیوں سے صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ پکے حنفی ہو جائیں

مطالبہ ان کا شافعیوں سے ہے۔ آج امام شافعیؒ (ف ۲۰۴ھ) کی قبر پر مصر میں

کچھ کیا جاتا ہے، کیا اسے وہ کسی حالت میں روا رکھ سکتے تھے؟ یہی حال دوسرے ا

کا ہے۔ ان میں سے کوئی بدعات کا روادار نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ محمدؒ بن عبدا

کے پیرو مسلمانوں کو انہیں بدعتوں سے باز رہنے کی دعوت دیتے ہیں، اور جو بار

فہمائش کے بعد بھی نہیں مانتا، اس سے سختی کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں۔ ان

اسی "شدت فی العمل" کو نہ جانے کن کن "فقہی گالیوں" سے تعبیر کیا گیا ہے؟ اور اسی

پر محض قیاس آرائی سے کام لے کر بے بنیاد افترا پردازیاں بھی کی گئی ہیں۔ اس ح

سی کتاب میں سینکڑوں صفحوں کی گالیوں اور بے شمار "بہتانوں" کی فہرست پیش

بہت دشوار ہے۔ پھر بھی آئندہ صفحات میں غلط بیانیوں کے کچھ نمونے دیئے جا

ہیں۔

---

[1] الزواجر: ج ۱ ص ۱۶۳، مطبعہ وھبیّہ، مصر۔

پانچواں باب

غلط بیانیاں اور افترا پردازیاں

وہابیت سب سے بڑی غلط بیانی شیخ الاسلام کی دعوت کے متعلق یہ کی گئی کہ اسے "وہابیت" کا نام دیا گیا۔ اس طرح یہ ارباب غرض نے یہ باور کرانا چاہا کہ یہ اسلام سے الگ کوئی دین ہے۔ انگریزوں، ترکوں اور مصریوں نے مل کر اسے ایسا ہوّا بنایا کہ اسلامی دنیا میں پچھلی دو صدیوں میں جتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور یورپی طاقتوں نے ان سے کوئی خطرہ محسوس کیا، جھٹ اس کا ڈانڈا نجد کی وہابیت سے ملا دیا گیا۔ مغرب کی سنوسی تحریک، فقہ کی جزئیات میں نجدی دعوت سے بالکل الگ بلکہ متناقض ہے۔ تاہم اسے بھی شیخ الاسلام ہی کی دعوت کا شاخسانہ بتایا جاتا ہے۔ اور صرف اس لئے کہ سنوسی تحریک اپنی جہادی سرگرمیوں کے باعث اٹلی کے لئے ایک عرصہ تک خطرہ بنی رہی۔ ہندوستان کی تحریک "تجدید و امامت" تو نجد سے اس طرح وابستہ کی گئی ہے، کہ غیر تو غیر، اپنے بھی دونوں کو ایک خیال کرنے لگے ہیں۔ اصلی مآخذ (کتاب و سنت) کے ایک ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن طریق کار اور اصول

دعوت میں نمایاں فرق ہے۔ اور اصولی مماثلت کے باوجود اپنی جگہ پر یہ ایک
ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت سید احمد شہید (ش ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور مولانا اسماعیل
شہید (ش ۱۲۴۶ھ) کی تحریکِ تجدید و جہاد پر نجدی دعوت کا بالکل اثر نہیں پڑا۔[1]
بہرحال جہاں تک وہابیت کو ایک الگ مذہب اور گمراہ جماعت بتانے کی
کوشش کی گئی ہے، یہ نام حد درجہ قابلِ اعتراض ہے ورنہ اس عام غلط بیانی اور
بہتان تراشی سے قطعِ نظر کر کے دیکھا جائے تو اس نام میں کوئی مضائقہ بھی نہیں معلوم
ہوتا۔ تحریکِ اصلاح و تجدید کے داعی محمد بن عبدالوہاب کی طرف اگر نسبت کی جاتی؛
تو ان کے پیروؤں کو "محمدی" کہنا چاہیئے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ مخالفین کی غرض "محمدی"
کہنے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ اس جماعت کی نسبت داعیٔ تحریک
کے والد ماجد شیخ عبدالوہاب کی طرف کرنے لگے۔ اور اس طرح پر یہ نام (وہابی اور
"وہابیت) مشہور ہوا۔ اور پھر یہ نسبت ایسی چل نکلی کہ کتنے مورخ اور تذکرہ نگاروں
نے عبدالوہاب ہی کے سر تجدید و اصلاح کا سہرا باندھ دیا مثال کے لئے ملاحظہ ہو:
براجس کی کتاب (۲، ۱۳۴)۔
یہ صاحب[2] براجس (Brydges) تو اپنے زعمِ باطل میں یہاں تک لکھ گئے
کہ "صاحبِ دعوت کے بیٹے محمد نابینا (ضریر) تھے" (ص ۱۳۴) غلط در غلط اسی کو کہتے
ہیں، حالانکہ شیخ الاسلام کے بڑے بیٹے حسین بن محمد بن عبدالوہاب کے ایک رسالے

---

[1] اس مسئلے پر راقم کی ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک اور مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر میں کافی
مواد مل سکتا ہے۔

[2] براجس کا ماخذ برک ہارٹ ہے، اس نے بھی عبدالوہاب ہی کو جماعت (باقی ص ۱۵۱ پر)

دفعہ ۱۲۲۴ھ) علامہ تھے۔ ہندوستانی مجاہدین کے بڑے کرم فرما ہنٹر صاحب بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

کا ترجمہ کرتے ہوئے، وہ مصنف کو بانی جماعت کا پوتا بتاتے ہیں۔[1]

بہرحال یہ "مبصر" اکیلے نہیں۔ ایک جماعت کی جماعت اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ بادیۂ عرب میں گھومنے والے یورپی سیاحوں کے پیش رو نی بور[2] نے بھی بانی جماعت کا نام عبدالوہاب ہی بتایا ہے اور کہتا ہے کہ "آج کل اس کے لڑکے محمد جانشین ہیں" یہ واضح رہے کہ نی بور ۱۷۶۴ء میں (یعنی شیخ کی وفات سے ۲۸ برس پہلے) بلاد عرب میں موجود تھا، لیکن اس باب میں، سب سے دلچسپ غلط فہمی عیسائی مبلغوں کے سرخیل پادری زویمر کو ہوئی ہے، عام شہرت کے مطابق وہ وہابی اور وہابیت کو الگ دین یا مذہب سمجھا، پھر اس نے امام ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کے افکار و آراء بھی وہابیوں سے ملتے جلتے دیکھے، جھٹ اس نے یہ اعتراض کر دیا کہ دیکھو "یہ وہابی ہیں، لیکن اپنے کو حنبلی، کہتے ہیں"[3] اس غریب کو یہ خبر نہیں، کہ وہابیت کی اصطلاح تو ابن قیم کے چار پانچ سو برس بعد رائج ہوئی۔

گو ہمارے پاس اس کا قطعی ثبوت نہیں، کہ پہلے پہل یہ نام کس نے رکھا؟[4] لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ نام مخالفوں نے شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں رکھ دیا تھا۔ مارگولیوتھ کا بھی یہی خیال ہے۔ گو وہ اس باب میں سند نہیں لیکن دوسرے قرینے بھی اس کی تائید[5] میں ہیں: شیخ الاسلام کے ایک معاصر (غالباً) ملا عمران بن رضوان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۰) کا بانی قرار دیا ہے (صفحہ ۹۶ ج ۲)، یہ تو یہاں تک بڑھ گیا، کہ بنو تمیم کی ایک شاخ Wahhabia الوہابی بھی اس نے وضع کر لی (صفحہ ۹۷)

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال (دسمبر ۱۸۷۴ء: صفحہ ۶۸) [2] صفحہ ۱۳۳-۱۳۱-

[3] المقتطف: جلد ۳۳، صفحہ ۲۹۵۔

[4] مقالہ "وہابیت"۔ [5] داؤد بغدادی (ت ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء) نے بھی صلح الاخوان میں یہی خیال ظاہر کیا ہے (بحوالہ Notes on Muhammedanism صفحہ ۲۱۹)

(سنہ [illegible]ھ) کے ایک قصیدے میں یہ لفظ آیا ہے:

ان کان تابع احمد متوھبًا   فانا المقر بانني وھّابی[۵۱]

ایک مصری[۵۲] معاصر کا بھی یہ خیال ہے کہ یہ نام مخالفوں نے ابتدائی لڑائیوں کے زمانے ہی میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

شیخ الاسلام کے یورپی معاصر نیبور[۵۳] نے وہابیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت (۱۷۶۴ء) تک "وہابیت" کی اصطلاح رائج نہیں ہو سکی تھی البتہ وہ شیخ کی دعوت کو (New Religion) کہتا ہے، گو پھر آخر میں "عبدالوہاب" کے نئے مذہب کو "محمدیت کی اصلاح" سے بھی تعبیر کرتا[۵۴] ہے۔

شیخ الاسلام کے تھوڑا عرصہ بعد دوسرے دو سیاحوں، (علی بیگ عباسی بادیا ۱۸۰۷ء) اور برک ہارٹ (۱۸۱۴ء) نے بھی نجدی تحریک اور دعوت سے بحث کی ہے۔ بادیا مصریوں کے قبضہ سے پہلے حجاز آیا تھا، افسوس کہ اس کا اصلی سفرنامہ دستیاب نہ ہو سکا

---

۵۱ افسوس کہ کوشش کے باوجود صحیح زمانہ کا پتہ نہیں چل سکا، بعض قرینے بتاتے ہیں کہ یہ شیخ کے معاصر نہیں تھے۔

۵۲ الہدیۃ السنیۃ: ص ۱۱۔

۵۳ محمد حامد الفقی: ص ۵۔

۵۴ سب سے پہلا یورپی سیاح جو ممالک عرب میں وارد ہوا (ملاحظہ ہو: باب مآخذ)

۵۵ جلد ۲ صفحہ ۵-۱۳۳۔

جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ اس نے "وہابی" کی اصطلاح استعمال کی ہے یا نہیں ہوگا رہتا۔ جو اقتباسات دیئے ہیں ان سے صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ برک ہارٹ ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ میں محمد علی مصری کے قبضے کے بعد حجاز آیا اور ۱۸۱۶ء میں اس نے "وہابیوں سے متعلق یادداشت تیار کی، جو بعد کو دو جلدوں میں Notes on the Bedouins and thew ahhabys کے نام سے شائع ہوئی ۱۸۳۱ء۔ اس نے "وہابی" کی اصطلاح بار بار استعمال کی ہے۔ کتاب مذکور کی دوسری جلد کے بہت کم صفحے اس لفظ (وہابی) سے خالی ہوں گے۔ اسی کے لگ بھگ عبدالرحمن جبرتی (ف ۱۲۳۸ھ) نے اپنی تاریخ مرتب کی، ان کے ہاں بھی وہابی کی اصطلاح بہ کثرت استعمال ہوئی ہے[1] ۱۲۱۸ھ کے حوادث میں لکھتے ہیں:

"وحضر صحبة الحجاج كثير من اهل مكة هروبا من الوهابي
ولغط الناس في خبر الوهابي واختلفوا فيه"[2]

اس سے پتہ ملتا ہے کہ مصریوں کے حملہ حجاز کے وقت یہ 'اصطلاح' عام ہوچکی تھی۔ بعد کے لکھنے والوں نے اس جماعت کو ہمیشہ وہابی ہی کے نام سے یاد کیا۔

ہم نے ابھی کہا ہے کہ صرف نام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ نام (وہابی) اس طرح پر مشہور کیا گیا کہ یہ گویا اسلام سے الگ کوئی مذہب ہے۔ اور یہی وجہ شکایت ہے اور اسی لئے غلط بیانیوں کی فہرست میں ہم نے اس نام کو سب سے اونچی جگہ دی ہے۔

سب سے پہلا مفتری

سب سے پہلے سلیمان بن محمد بن سحیم (ف ۱۱۸۱ھ) نے شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں غلط باتیں منسوب کرنا

---

[1] ملاحظہ ہو: جلد ۳ صفحہ ۲۳۲، ۲۳۵، ۲۵۲، ۲۵۳ الخ۔ [2] عجائب الآثار: ۳: ۸۱-۸۲۔

(۱۵۲، تاریخ نجد) ... ۱۵۵

شروع کردی تھیں[1] اس لئے دنیائے اسلام کے نام اپنی گشتی چھٹی میں حسب ذیل الزام لگائے ہیں:-

جبیلہ میں زید بن خطاب کی قبر کا انہدام، قبر[2] کے پاس ایک مسجد کا انہدام، دلائل الخیرات[3] اور روض الریاحین کو نذر آتش کرنا، ابن فارض اور ابن عربی کی تکفیر سو زید اور ان کے ساتھیوں کی قبروں کا پتہ ہی نہیں۔ دلائل الخیرات اور اور روض الریاحین کے جلانے کی خبر بہتان ہے۔ البتہ ان کتابوں کے پڑھنے سے شیخ نے ضرور منع کیا تھا۔ ابن عربی، ابن فارض اور ان جیسے متصوفین کی تکفیر شیخ سے منقول ہے:-

وقد کفر الشیخ ابن العربی وابن الفارض وامثالہما۔[4]

دوسرے معاصر اور ان کی گالیاں

شیخ الاسلام کے بعض دوسرے معاصروں نے بھی ابن سحیم کا ہاتھ بٹایا، لیکن ان کی کتابوں میں گالیوں اور افترا پردازیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان مخالفوں میں احمد بن علی بصری قبانی[5] (سنہ ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء)، محمد بن عبدالرحمن بن عفالق احسائی حنبلی (سنہ ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء) عبداللہ بن عیسی مویس (م ف سنہ ۱۱۷۵ھ) اور ابن فیروز (ف[5] سنہ ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۱ء) زیادہ نامور ہیں۔ ان صاحبوں کے بعد دوسری صف میں عفیف الدین عبداللہ بن داؤد زبیری

(بقیہ حاشیہ ۱۵۳) سلیمان بن محمد بن احمد بن علی بن سحیم ہے۔ اس کا باپ محمد بن احمد بھی دعوت کے مخالفوں میں تھا۔ (روضۃ: ۱، ۳۸؛ السحب: ص ۳۱۳) [1] یہ چٹھی روضۃ الافکار (۱، ۲۸-۴۲) میں پوری نقل کی گئی ہے۔ نیز روضۃ الافکار: ۱، ۳۷۔ [3] روضۃ الافکار: ۱، ۱۹۶، ۱۵۸، ۱۹۸،

[5] ان صاحبوں کے صحیح سال وفات نہ معلوم ہو سکے، یہ سنین کتاب کی تالیف کے ہیں۔ یا یہ کہ۔۔۔ ان سنین میں ان کا موجود ہونا ثابت ہے۔

حنبلی (ف ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)، احمد عبداللہ الحداد باعلوی تریمی شافعی[1] کے نام آتے ہیں۔ مآخذ اور لٹریچر کے ضمن میں ان کتابوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ابن غنام نے بھی ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے[2]۔ اور ابن فیروز کی ایک نظم کا جواب بھی دیا ہے۔ اب رہی ان صاحبوں کی گالیاں، سو ان کے نقل کی ہمت نہیں۔ پھر بھی ان کی غیرت اور متانت اخلاق کے اظہار کے لئے ایک اقتباس کی اجازت چاہتا ہوں، امید ہے کہ اہل علم معاف رکھیں گے۔

عبداللہ بن داؤد زبیری (ف ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کی کتاب الصواعق والرعود[3] کے آغاز میں دو تقریظیں ہیں۔ پہلی تقریظ محمد بن فیروز حنبلی (ف ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء) کی لکھی ہوئی ہے (مورخہ ۱۸ صفر سنہ ۱۲۱۰ھ)

اس تقریظ کے آغاز ہی میں حسب ذیل عبارت پر نظر پڑتی ہے، جسے دیکھ کر شاید شرم و حیا بھی پانی پانی ہو جائے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، ایک بار ذرا جی کڑا کر کے ملاحظہ کر لیجیے:

"... بل لعل الشیخ [یعنی عبد الوھاب] غفل عن مواقعة امه [یعنی محمد بن عبدالوھاب] فسبقه الشیطان الیھا فکان اباھذ اللارہ الخ"

کیا لکھنؤ کی بھٹیارنیں اس سے زیادہ پھکڑ کر سکتی ہیں؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تحریر سنہ ۱۲۱۰ھ کی ہے۔ ابن غنام سنہ ۱۲۱۱ھ[4] کے حوادث میں، انہیں ابن فیروز کی ایک نظم کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

---

[1] صحیح سال وفات نہ معلوم ہو سکا۔ تیرھویں صدی ہجری میں موجود ہونا ثابت ہے۔

[2] روضۃ الافکار: ۱: ۲۰۹؛ ۲: ۲۱۴۔ [3] مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ: ع ۱۲۳۸

[4] ایضاً ۲: ۲۱۴۔

"وقد وصل الینا من ھاتیک الدیار منظومة لابن فیروز
... متضمنة لاقبح العبارات"

جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ فحش گوئی ان صاحب کی سرشت میں داخل تھی۔

غلط بیانیوں کے نمونے

(الف) ادعاء نبوت: شیخ کی دعوت کے مخالفوں کو جب حرف رکھنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ کہتے۔

"کہ اصل میں یہ نبوت کا دعوی کرنا چاہتے تھے، لیکن اخفاء سے کام لیا"[1]

اسی الزام کو احمد زینی دحلان (۱۲۳۲ھ - ۱۳۰۴ھ) ان لفظوں میں دُہراتے ہیں:

والظاھر من حال محمد بن عبد الوھاب انہ یدعی النبوۃ الا انہ ما قدر علی اظھار التصریح بذلک[2]	اور محمد بن عبد الوہاب کے حالات سے یہ پتہ لگتا تھا کہ وہ نبوت کا دعویٰ رکھتے ہیں، لیکن اس کے صاف صاف اعلان کی جرأت نہ ہوئی۔

حیرت ہے کہ نی بور نے بھی سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے لکھ دیا کہ "عبدالوہاب رسولوں کو بڑا آدمی سمجھتا تھا، لیکن وہ الہام یا فرشتوں کے ذریعہ وحی کا قائل نہیں تھا"[3]

اس سلسلے کا ایک اور شرمناک نمونہ ہمیں راونشا (Ravenshaw) کی اس یادداشت میں ملتا ہے[4]، جو اس نے پٹنہ کے کلکٹر کی حیثیت سے مولانا

---

[1] مصباح الانام (مخطوط)، ورق ۵-۶

[2] الدرر السنیۃ: ص ۴۶

[3] سفرنامہ نی بور: ۲، ۱۳۴۔

[4] کلکتہ گزٹ: ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء، ضمیمہ (ص ۵ بعد ۱۳۴۳)

احمد اللہ صادق پوری[1] کے مقدمے میں لکھ کر دی تھی:-

"اس مصلح کا خیال تھا کہ کبھی کسی انسان کو براہ راست اللہ کی طرف سے الہام نہیں ہوا، اور کوئی مقدس کتاب ایسی وجود میں نہیں آئی جسے الہامی (Divine) کہہ سکیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ عبدالوہاب (؟) کے خیال کے مطابق کوئی مذہب الہامی ہوا ہی نہیں، اور اگر وہ 'محمدی' مذہب کو (Divine) کہتا ہے، تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے براہ راست آیا تھا، بلکہ صرف اس کی کاملیت کی وجہ سے"

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے:-

"اصلاح یافتہ مسلمان (محمڈن) کی ان بدوؤں میں خوب پذیرائی ہوئی، جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ایک برگزیدہ (Divine) آدمی نہیں تسلیم کیا، اور نہ وہ قرآن کو الہامی کتاب مانتے تھے"

۱۸۶۵ء میں ہمارے ضلع کے اس کلکٹر کی یہ یادداشت اسی قسم کی جہالت کے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ مجاہدین ہند کے مشہور کرم فرما سر ولیم ولسن ہنٹر W. W. Hunter بھی اپنی کتاب[2] میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

---

[1] مولانا احمد اللہ صادق پوری خاندان صادق پور پٹنہ کے ممتاز فرد اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں منسلک تھے۔ آپ پر ۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ میں سازش کا مقدمہ چلا، ہائی کورٹ سے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ تقریباً سترہ برس انڈمان میں رہ کر، وہیں وفات پائی (ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ / نومبر ۱۸۸۱ء) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔

[2] The Indian Mussalmans ص ۵۶-۵۵

"بدوؤں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برگزیدہ (Divine) نہیں تسلیم کیا تھا اور نہ قرآن کو الہامی کتاب" الخ۔

غالباً ان کا ماخذ مسٹر داونشا کی یہی یادداشت ہے، اور ہو سکتا ہے، کہ ان دونوں کا ماخذ نی بور کا سفرنامہ ہو، کہ یورپ کو اس جماعت کے متعلق پہلی اطلاع اسی کے ذریعہ ملی۔

(ب) انکار حدیث:۔ زمانہ کی بوالعجبی بھی دیدنی ہے، وہ شخص جس کا اوڑھنا بچھونا سنت رسول ہو، اس پر انکار حدیث کا الزام رکھا جاتا ہے۔ اس بہتان تراشی کا سہرا بھی مُصباح الانام کے مصنف احمد عبداللہ الحداد باعلوی کے سر ہے[1]۔ اس سے زیادہ عجیب تر یہ ہے کہ اس بے سروپا بہتان کو ہمارے ملک کے ایک مشہور[2] اہل قلم (عبداللہ یوسف علی) نے اس بیسویں صدی میں پھر دہرایا ہے:۔

---

[1] کتاب مذکور: ورق ۶۰ ب

[2] یہ کچھ ان صاحب ہی پر موقوف نہیں، ہمارے ملک کے عالم و تعلیم یافتہ سب ایسی ہی بے سروپا باتیں اس جماعت کے متعلق لکھتے رہے ہیں، ان سب کے پیش رو ایک بزرگ مولوی فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۷۲ء) نے ایک کتاب "تصحیح المسائل در تردید فرقہ نجدیہ ارازل" لکھی ہے۔ جو خرافات کا مجموعہ ہے۔ ابھی ایک معاصر نے اپنی کتاب (آثار جمال الدین) میں بھی اس جماعت کے متعلق بے سروپا باتیں لکھ دی ہیں (ص ۳۳۶-۷) یہ دو صفحوں کا پورا بیان غلطیوں اور غلط فہمیوں کا افسوس ناک مجموعہ ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کے ہاں "سنوسیوں اور نجدی وہابیوں کے عقائد کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں" (ص ۳۳۹)

"...... اور (کرامت علی) احادیث پر یقین رکھتے ہیں، جنہیں وہابیوں نے مسترد کردیا تھا"

"وہ قدیم اور صوفی عقائد کے حامی ہیں[1]"

یہ ہے ہمارے مترجم قرآن کی واقفیت ایک اسلامی جماعت کے متعلق۔ اب آئیے ہم آپ کو عبرت اور تقابل کے لئے ایک متعصب پادری کا بیان سنائیں۔ ٹھومس ہیوز (Thomas Patric Hughes) وہابی اور پروٹسنٹ جماعتوں کا باہمی مقابلہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے:-

"وہابیت کو بسا اوقات اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ بتایا جاتا ہے......

...... اگرچہ بڑا فرق یہ ہے کہ عیسائی پروٹسٹانیت مقدس الہامی کتابوں کی اصلی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے روایتی تعلیمات کو مسترد کرنا بھی ضروری خیال کرتی ہے، اس کے برعکس وہابیت قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثوں پر بھی زور دیتی ہے[2]"

(ج) تکفیر و قتال مسلمین: شیخ الاسلام اور ان کے ماننے والوں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہل قبلہ کی تکفیر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے قتال جائز سمجھتے ہیں، یہ الزام مختلف وقتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے، خود شیخ کی زندگی میں بھی یہ الزام رکھا گیا تھا، اور انہوں نے خود بھی اس کی صاف صاف تردید کی تھی، ملاحظہ ہو:

واذا کنا لا نکفّر من عبد الصنم	اور جب ہم ان لوگوں کی تکفیر نہیں کرتے، جو جہالت
الذی علی قبة عبد القادر والصنم	اور عدم تنبیہ کے سبب سے ان بتوں کی پرستش کرتے

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ: ص ۱۹۲   [2] ڈکشنری آف اسلام: ص ۶۶۱

الذی علی قبر احمد البدوی وامثالهما لاجل جهلهم وعدم من ینبههم فکیف نکفر من لم یشرك بالله ولم یهاجر الینا ولم یکفر .... سبحانك هذا بهتان عظیم۔

ہیں، جو (شیخ) عبد القادر اور (شیخ) احمد بدوی اور ان جیسے بزرگوں کی قبروں پر بنے ہوئے ہیں، تو پھر ہم ان لوگوں کی تکفیر کس طرح کر سکتے ہیں، جنہوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا، یا ہجرت کر کے ہمارے پاس نہیں آئے اور کسی کفر کے مرتکب نہیں ہوئے۔

لیکن ان تردیدوں کے باوجود یہ الزام مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ ساتھ بار بار دہرایا گیا ہے۔ دو تین مثالیں پیش ہیں:

ابن عابدین شامی (ف ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء) اپنے مشہور حاشیہ رد المحتار میں فرماتے ہیں:

کما وقع فی زماننا فی اتباع عبد الوهاب (؟) الذین خرجوا من نجد وتغلبوا علی الحرمین وکانوا ینتحلون مذهب الحنابلة لکنهم اعتقدوا انهم هم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشرکون واستباحوا بذلك قتل اهل السنة وقتل علمائهم ١

جیسا کہ ہمارے زمانے میں عبد الوہاب (؟) کا حال ہوا۔ لیکن ان کا اعتقاد تھا کہ صرف یہی مسلمان ہیں، اور ان کے اعتقاد کے مخالف سب مشرک ہیں، اور اسی بنیاد پر انہوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کا قتل روا رکھا۔

احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) کو تو اس جماعت سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اس نے بار بار اس الزام کو دہرایا ہے۔ ٢

ہمارے ملک کے نامور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان صاحب (ف ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء)

---

١ رد المحتار، ۳، ص ۳۰۹

٢ الدرر السنیة: ص ۴۶-۴۵؛ خلاصة الکلام، ص ۲۲۹-۲۳۰، ۲۳۲

بھی اس جماعت کے بارے میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے ان کی مختلف کتابوں[1] میں اس جماعت کے متعلق الجھے ہوئے بیانات ہیں، البتہ اتحاف النبلاء میں ان کا بیان ایک حد تک اچھا اور حقیقت سے قریب تر ہے، پھر بھی غیر مشروط "تکفیر" کا الزام اس میں موجود ہے[2] اور تو اور یمن کے نامور عالم اور محقق، قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) کو بھی اس باب میں اہل نجد کے مسلک کی صحیح صحیح اطلاع نہیں مل سکی تھی، جس کے وہ خود بھی شاکی ہیں:-

ولکنہم یرون ان من لم یکن داخلا تحت دولۃ صاحب نجد وممتثلا لاوامرہ خارج عن الاسلام وتبلغ عنہم اشیاء اللہ اعلم بصحتہا[3].....	لیکن ان کا خیال ہے کہ جو امیر نجد کے دائرہ اطاعت سے باہر ہے وہ اسلام سے خارج ہے، ان کے بارے میں اور بھی طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں؟

پھر آگے چل کر "نماز باجماعت ترک کرنے والوں سے قتال" کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن تارک صلوۃ کی تکفیر جائز رکھتے ہیں[4]۔

اہل نجد پر تکفیر اہل قبلہ کا الزام اگر مخالفوں نے رکھا، تو اس کی ایک طرح پر اصلیت بھی ہے اور اس میں معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے التباس کی گنجائش ہے۔ ہم یہاں پر اہل نجد کی زبان میں ان کا مسلک بیان کر دیتے ہیں، جو کوئی نیا مسلک نہیں، بلکہ حنابلہ اور ظواہر کا مشہور مسلک ہے۔

شیخ الاسلام کے شاگرد، احمد بن ناصر بن عثمان معمری نجدی (ف ۱۲۲۵ھ) نے

---

[1] ترجمان وہابیہ، ہدایۃ السائل، موائد العوائد، التاج المکلل وغیرہ۔ [2] ص ۴۱۳

[3] البدر الطالع: ۲، ۵۔ [4] ایضاً۔

سنہ ۱۲۱۱ھ میں علمائے حرم شریف کے سامنے جو تین مسئلے پیش کئے تھے، ان میں سے دوسرے کا خلاصہ ان کی زبان میں یہ ہے:-

اما من قال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وھو مقیم علی شرکہ یدعو الموتی ویسالھم قضاء الحاجات وتفریج الکربات، فھذا کافر مشرک حلال الدم والمال وان قال لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وصلی وصام وزعم انہ مسلم

جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے کے بعد بھی شرک پر قائم ہے، مُردوں سے دعائیں مانگتا، ان سے ضرورتوں کے پورا کرنے اور مصیبتوں کے دور کرنے کی درخواست کرتا ہے تو وہ کافر او مشرک ہے، اس کا خون اور مال حلال ہے۔ اگرچہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے، نماز پڑھتا اور روزے رکھتا ہے اور اپنے کو مسلمان بھی سمجھتا ہے۔

اسی رسالے میں ابن معمر نجدی نے سستی سے نماز ترک کرنے والوں سے بھی قتال کو جائز رکھا ہے، اور زہری اور امام ابو حنیفہ کے علاوہ تمام ائمہ کا اجماع نقل کیا ہے[۱] تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں، حنابلہ کا یہ مشہور مسلک ہے، اور اسی پر اہل نجد عامل ہیں، تارک صلوٰۃ کا کفر، ان کے نزدیک محقق ہے[۲]:

ومن لا یُصلّ فھو لاشک کافر کما قالہ المعصوم اکملُ سیّد

اور جو نماز نہیں پڑھتا، وہ بے شک کافر ہے، جیسا کہ سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔

تارک صلوٰۃ کے بعد قبر پرستوں (عُبّاد قبور) کا مسئلہ آتا ہے۔ شیخ کے پیش رو اور

---

[۱] الاجماع علی تارک الصلوٰۃ کسلاً بخلاف ابی حنیفۃ والزہری؛ تفصیل کے لئے: الہدیۃ السنیہ صفحہ ۸۶ - ۶۹ - ۵۲ الہدیۃ السنیۃ: صفحہ ۱۰۵

اور ہم مشرب معاصر محمد بن اسماعیل الامیر یمنی (ف ۱۱۸۲ھ) بُت پرستوں (عُبّادِ اصنام) اور قبر پرستوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کرتے۔[1] شوکانی نے ان کا "رجوع" نقل کیا ہے، اور "عُبّادِ قبور" پر اس تشدد کی سخت مخالفت کی ہے۔[2] سلیمان بن سحمان نے اس "رجوع" کی پُرزور تردید کی ہے۔[3] اور یہی قرین قیاس ہے، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب بھی محمد بن اسماعیل الامیر کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ شیخ الاسلام "اتمام حجت" شرط قرار دیتے ہیں، اور اسی لئے تمام مسلمانوں کی تکفیر نہیں کرتے۔

ومن جملة هذه الاكاذيب ما ذكره ... ان الشيخ الاسلام محمد بن عبد الوهاب رحمه الله يسفك الدماء وينهب الاموال ويتجارى على قتل النفوس ... وتكفير الامة المحمدية في جميع الاقطار [4] [illegible]

انہیں افتراء پردازیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ شیخ الاسلام محمد عبدالوہاب خون بہاتے ہیں اور مال لوٹتے ہیں اور لوگوں کے قتل کی جسارت کرتے ہیں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں ...... یہ سب سراسر جھوٹ ہے۔

اس عمومی تکفیر کی اہل نجد پرزور تردید کرتے ہیں۔ لیکن وہ اتمام حجت اور تبلیغ کے بعد تکفیر اور قتال کے قائل نظر آتے ہیں:

فلم يكفر رحمه الله الا عباد الاوثان من دعاة الاولياء والصالحين وغيرهم ممن اشرك بالله وجعل له انداداً

تو شیخ رحمہ اللہ نے صرف ان صنم پرستوں کی تکفیر کی، جو اولیاء اور نیکو کار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں، جنہوں نے حجت کے ثبوت اور طریق حق

---

۱ تطہیر الاعتقاد: ص ۱۲ ۲ الدر النضید: ص ۴۰-۳۵

۳ تبرئۃ الشیخین الامامین: ص ۸۳-۸۲

۴ " " ص ۸۸

بعد اقامة الحجة ووضوح المحجة ولعن ان بدؤوا بالقتال فحينئذ قاتلهم وسفك دماءهم ونهب اموالهم ومعه الكتاب والسنة والاجماع سلف الامة۔[1]

کی وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب اور اللہ کا شریک ٹھہرایا۔ اور پھر انہوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب شیخ نے ان سے قتال کیا اور ان کا خون بہایا اور ان کا مال لوٹا اس حال میں کہ کتاب، سنت واجماع، سب کی شہادتیں ان کی تائید میں ہیں۔

یہاں اتمام حجت کے علاوہ ایک دوسرا عذر بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ مخالفوں نے قتال کی ابتدا کی۔ ایک دوسری جگہ شیخ کا یہ قول منقول ہے:

فجنس هولاء المشركين وامثالهم ممن يعبد الاولياء والصالحين نحكم بانهم مشركون ونرى كفرهم اذا قامت عليهم الحجة الرسالية۔[2]

تو یہ اور ان جیسے مشرک جو ولیوں اور نیکوکار بندوں کی پرستش کرتے ہیں، ان کے بارے میں ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تبلیغی حجت قائم ہو جانے کے بعد ہم ان پر شرک کا حکم لگاتے ہیں اور ان کو کافر سمجھتے ہیں۔

ان اقتباسات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیخ اور ان کے پیرو تکفیر، اور قتال، کے لئے تبلیغ اور اقامت حجت، شرط قرار دیتے ہیں، اسی لئے عمومی تکفیر کے الزام کی یہ پرزور تردید کرتے ہیں؛ البتہ قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو یہ صرف 'کفر عملی' نہیں سمجھتے، جیسا کہ عام طور پر 'کفر عملی' اور 'کفر اعتقادی' کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔[3]

---

[1] تبرئة الشيخين، ص ۸۶ [2] الهدية السنية [3] الهدية السنيه۔

[4] رسالہ اشاعت السنۃ (ع ۵ جلد ۶: سنہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء) نے ہندوستان کے اہل حدیث حضرات کا اختلاف اس مسلک سے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

"اہل حدیث ہند وہابیہ نجد سے تکفیر و قتل میں مخالف ہیں" (ص ۲۱۶)۔

یہ 'توحید ربوبیت' کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ 'توحید الوہیت' کو بھی اسلام کے لئے ضروری اور بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ اللہ کو صرف 'خالق' اور 'مدبر کائنات' سمجھنے سے نجات نہیں ہو سکتی۔ 'توحید ربوبیت' کے تو اہل جاہلیت بھی قائل تھے۔ البتہ وہ 'الوہیت' میں شریک کرتے تھے، اور اسی لئے وہ ہر شجر حجر کو جس کی وہ پرستش کرتے، اِلٰہ ہی کے نام سے موسوم کرتے۔ اس زمانے کے جاہلوں اور مشرکوں نے غیر اللہ کو اِلٰہ کہنے سے تو پرہیز کیا، لیکن الوہیت کے تمام لوازم (نذر، دعا، طواف، قربانی وغیرہ) غیر اللہ کے لئے بھی عام کر دئیے۔ اور اس کا نام 'توسل' یا استشفاع رکھ دیا تو نام رکھنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴) نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی موائد العوائد میں اس پر بہت زور دیا ہے، لیکن ان کا طرز بیان الجھا ہوا ہے، اور کرنل مندیک امریکی کی کتاب المرآۃ الوضیۃ فی الکرۃ الارضیۃ پر اعتماد کے باعث بہت سی غلط باتیں بھی لکھ گئے ہیں، جن سے اہل نجد کا دامن پاک رہا ہے۔

[۱] تبرئۃ الشیخین الامامین" کے حاشیہ میں ایک جگہ پر (ص ۱۲۴) علامہ سید رشید رضا مرحوم نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت صحیح لغت کی واقفیت کی بناء پر اپنے ہر معبود (شجر ہو یا حجر) کو اِلٰہ ہی کہتے تھے، اس لئے کہ اس لفظ کے صحیح معنی یہی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے زمانے کے مشرک لغت اور زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھے کہ اسلام غیر اللہ کو اِلٰہ کہنے سے روکتا ہے، ورنہ عبادت کی تمام باتیں (مُردوں سے مرادیں مانگنا، نذر، قربانی، قبروں کا طواف) ان کے نزدیک توحید کے منافی نہیں، تو اس طرح پر مشرکین جاہلیت نے صرف دین پر ظلم کیا اور اس زمانے کے مسلمان مشرکوں نے دین اور زبان دونوں پر ظلم کیا (وکذٰلک قلت

یہ ہے خلاصہ شیخ کے مسلک کا۔ جماعت کی کتابوں میں اس مسئلے کی پوری پوری وضاحت کی گئی ہے۔ سلیمان بن سحمان کی تبرئۃ الشیخین الامامین (صفحہ ۸۲-۲۱۵) تو اسی کے لئے وقف ہے۔ 'مآخذ' کے ضمن میں دوسری کتابوں کا ذکر آتا ہے تفصیل کے لئے ان کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ یہاں پر صرف ایک بات ذہن نشین کر لینا چاہئے' کہ اہلِ نجد مسلمانانِ عالم کی عمومی تکفیر نہیں کرتے، بلکہ صرف ان لوگوں کی جو مشرکانہ اعمال میں گرفتار ہیں۔ اور تبلیغ و دعوت کے بعد بھی اپنی گمراہی سے باز نہیں آتے' اور ایسے لوگوں سے قتال بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

شیخ نے اپنی مختلف کتابوں میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے قتال مانعین زکوٰۃ سے بار بار استدلال کیا ہے۔[۵]

مندرجہ بالا اقوال و اقتباسات میں جہاں تردید ہے' وہ اسی عمومی تکفیر کی تردید ہے۔ اور جہاں اس کا اعتراف ہے وہاں اتمام حجت اور تبلیغ کے بعد بھی مشرکانہ اعمال پر اصرار کرنے والوں سے متعلق ہے۔

اگر الزام عائد کیا جائے اور اس کا 'منشا' بھی بتا دیا جائے' تو انسان غور کر سکتا ہے' اور ممکن ہو' تو غلط فہمی کے ازالے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن خواہ مخواہ کی بدگمانی اور بے بنیاد غلط بیانی پر تو صرف اظہار افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی دُکھ ہُوا کہ اس دور میں بھی ہمارے مُلک کے بعض مشہور علماء شیخ محمد بن عبدالوہاب کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) ان مشرکی المسلمین قد جنوا علی الدین و اللغۃ العربیۃ و مشرکی الجاھلیۃ حافظوا علی لغتھم فسمّوا کل شی ء باسمہ)۔

[۵] اربع قواعد؛ روضۃ الافکار: ۱، ۱۳۷، ۱۸۵؛ ۲، ۳۲۔

متعلق عجیب وغریب خیال رکھتے تھے۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) جیسے عالم کا شیخ کے متعلق یہ لکھنا:۔

اما محمد بن عبد الوهاب النجدی فانه کان رجلا بلیدا قلیل العلم فکان یتسارع الی الحکم بالکفر[۱]	اور محمد بن عبد الوہاب نجدی تو ایک کم علم اور کم فہم انسان تھا، اور اسی لئے کفر کا حکم لگانے میں اُسے کوئی باک نہیں تھا۔

تو حد درجہ افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے۔ حیرت ہے کہ کتاب التوحید کے مصنف کو مولانا سید انور شاہ صاحب نے "بلید" اور "قلیل العلم" کہنے کی جرات کیسے کی؟

(۵) عام غلط بیانی: شیخ اور ان کے ماننے والوں کے متعلق طرح طرح کی بے بنیاد باتیں شروع ہی سے کہی جانے لگی تھیں۔ شیخ الاسلام کے صاحبزادے شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب کے اس رسالے میں بھی جو انھوں نے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں اہل مکہ کے لئے لکھا تھا، اس قسم کی غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے[۲]۔

واما مایکذب علینا سترا للحق ... بانا نفسر القرآن برایئنا ونأخذ من الحدیث ما وافق فهمنا ... وانا نضع من رتبة	اور یہ جو حق پوشی کی راہ سے ہمارے متعلق جھوٹ جھوٹ کہا جاتا ہے کہ ہم قرآنِ مجید کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور حدیث نبوی سے وہی حصہ لیتے ہیں

---

[۱] فیض الباری: ۱، ۱۷۱۔

[۲] آلوسی نے تاریخ نجد (ص ۵۰-۹۰) میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اتحاف النبلا (ص ۴۰۶-۴۱۲) میں رسالے کا یہ حصہ پورا پورا نقل کیا ہے۔

نبینا صلی اللہ علیہ وسلم بقولنا:
"النبی رمۃ فی قبرہ وعصا احدنا
انفع منہ، ولیس لہ شفاعۃ وان
زیارتہ غیر مندوبۃ .... وانا
مجسمۃ وانا نکفر الناس علی
الاطلاق ... فجمیع ھذہ الخرافات
واشباھھا ... کان جوابنا فی
کل مسألۃ من ذلک سبحانک
ھذا بھتان عظیم"
(الھدیۃ السنیۃ ص۴۶)

جو ہمارے فہم (اور ذوق) کے مناسب ہو
اور یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
شان گھٹانے کے لئے "النبی رمۃ فی
قبرہ" (نبی کریم قبر میں ایک بوسیدہ ہڈی
سے زیادہ نہیں) اور "عصا احدنا انفع
منہ" (ہم میں سے کسی ایک کی چھڑی ان سے
زیادہ نفع بخش ہے) جیسے (گستاخانہ)
فقرے کہا کرتے ہیں؛ اور یہ کہ رسولِ کریم
(صلی اللہ علیہ وسلم) کو شفاعت کا حق نہیں ہوگا؛
اور یہ کہ قبرِ اطہر کی زیارت مستحب نہیں ہے؛
...... اور یہ کہ ہم تجسیم کے قائل ہیں؛ اور یہ کہ ہم تمام لوگوں کی علی الاطلاق
تکفیر کرتے ہیں؛ تو ان سب اور ان جیسی دوسری بے سروپا باتوں میں سے ہر ایک
کے متعلق ہمارا جواب "سبحانک ھذا بھتان عظیم" کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

(۵) انہدام قبہ نبوی: مخالفوں نے ایک بے بنیاد الزام یہ بھی تراشا کہ سعود بن عبدالعزیز
بن محمد بن سعود (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) نے قبہ نبوی کو بھی منہدم کرا دیا تھا۔ یہ عجیب
بات ہے کہ یورپی مورخوں نے خواہ مخواہ اس بے سروپا افسانے کو مزے لے لے کر
بیان کیا ہے۔ سٹاڈ (حاضر: ۱، ۲۶۴)؛ ھیوجینز ـــ (ڈکشنری آف اسلام: ص۶۶۰)؛
زویمر (ص۱۹۵)؛ بلنٹ (فیوچر آف اسلام: ص۴۵)؛ مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن
اینڈ ایتھکس: ۱۲: ۶۶۱) اور ان کے علاوہ ایک جماعت ہے؛ جس نے اس بے بنیاد

الزام کو موقع بے موقع دہرانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد اور سرتاپا افترا ہے۔ اس کی تعمیر[1] کے متعلق ان کا جو کچھ بھی خیال ہو لیکن قبۃ الرسولؐ کی طرف بری نگاہ سے دیکھنے کی بھی انھوں نے کبھی جرأت نہ کی۔ عام قبوں کے انہدام اور زر و جواہر کی تقسیم کا وہ خود خوشی خوشی ذکر کرتے ہیں۔ یہاں ان کے متعلق ازراہِ الزام جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن یہ الزام قطعی بہتان ہے اور قبۃ الرسولؐ کے ساتھ سوءِ ادب کی روایت یکسر بے بنیاد اور افترا ہے۔

براجس (جو اہلِ نجد کے دورِ عروج میں بصرہ اور بغداد میں رہ چکا ہے) اس افترا کی تائید تو نہ کر سکا، لیکن اہلِ نجد کی نیت پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہا، وہ لکھتا ہے:۔

"اس نے (سعود بن عبد العزیز) قبہ شریفہ کے انہدام کا بھی ارادہ کیا[2] لیکن غالباً قبے کے استحکام یا منہدم کرنے والے آلات کی کمی کے باعث ایسا نہ کر سکا، اور قبہ محفوظ رہ گیا۔"

ان براجس صاحب کی شخصیت اور ان کے بیان کی اہمیت تو اگلے باب سے معلوم ہوگی۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ بصرہ ۱۷۸۴ء ہی میں آچکا تھا۔ یعنے

---

[1] ملا ۲۲۳ براجس صاحب کے پیش رو اور پیرِ مغاں برک ہارٹ (جس کی کتاب سے وہ تقریباً حرف بحرف نقل کرتا ہے) نے صرف اس قدر لکھا تھا۔

"اس نے مقبرے کے بڑے گنبد کو بھی گرانے (Destroy) کی کوشش کی۔" (ج ۲ ص ۱۹۹) براجس نے غالباً سے حاشیہ آرائی کی کوشش کی ہے۔ (آگے ص ۱۷ پر)

شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں عرب علاقوں سے اس کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، جو مختلف حیثیتوں میں ایک عرصہ تک قائم رہا۔

ایک واقف کار انگریز کی شہادت: غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا ایک انبار ہے۔ کہاں تک انہیں کھنگالا جائے، اب ہم اس گفتگو کو براجس کے ایک بیان پر ختم کرتے ہیں، جس میں اس نے بعض 'غلط بیانیوں' کی تردید کی ہے ؎۱۔

"باب عالی نے مشہور کیا کہ اس نے (سعود بن عبدالعزیز) مدینہ منورہ کی زیارت سے لوگوں کو روک دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں اس نے صرف روضہ (مطہرہ) کے سامنے مشرکانہ اعمال کے ارتکاب سے منع کیا ہے جیسا کہ وہ دوسرے ولیوں کی قبروں پر بندش کر چکا ہے ؎۲"

"بعض جاہل انہیں کافر سمجھتے ہیں، افواہوں پر ترکوں نے اعتماد کیا اشراف مکہ نے اسے ہوا دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث پر پورے عامل ہیں۔ برک ہارٹ نے صحیح لکھا ہے یہ سب غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ اصل میں یہ اسلام کے اندر خالص تطہیر (Puritanism) کی تحریک تھی"

"ایک بے وقوف فرنچ نے ۱۸۰۸ء میں لکھا کہ یہ کوئی نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں، نیز وہ سعود کے "خاص آدمی" کی زبانی حج کی منسوخی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹) لیکن برک ہارٹ کی یہ اطلاع یقینی غلط ہے آگے چل کر وہ خود لکھتا ہے کہ "مقبرے کو گزند نہیں پہنچا"

(۱) ایضاً۔ (۲: ۲۰۰: ۱۱۰-۱۰۹)

کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہابی قرآن کی طرح حدیث کو بھی اصولی چیز (Eundamental) مانتے ہیں۔ البتہ اولیاء اور انبیاء کو یہ انسان مانتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد سعود نے جو اعلان کیا تھا، وہ آج بالکل کتاب و سنت کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے۔ تمباکو نوشی مالکیہ کے ہاں ممنوع ہے، انھوں نے بھی ممنوع کیا۔

"البتہ قہوہ کے امتناع کی خبر بالکل غلط ہے۔ اسے ترکوں نے پروپگنڈے کے طور پر مشہور کیا۔ جس بے وقوف فرینچ[۱] نے حج کے تعطل کا ذکر کیا ہے، اُسے جاننا چاہیے تھا کہ سعود نے صرف 'حج' کے بُرے مراسم کو روکا تھا۔ مکہ میں داخلے کے بعد اس نے جو پہلا کام کیا وہ طواف و عمرہ کی ادائگی تھی[۲]۔

......"

ایک عجیب افتراء | سلیل بن رازق کی Imams and Syeds of Oman میں ایک بدوی شیخ کی زبانی یہ افسانہ نقل کیا گیا ہے کہ "وہابیوں کے پاس قرآن مجید کا وہ حصہ بھی ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف سے حذف کر دیا تھا[۳]" الخ الخ

---

[۱] Rousseau نے ۱۸۰۹ء میں مندرجہ ذیل دو کتابیں لکھیں، جس میں اس نے وہابیوں پر 'حج' کے روکنے کا بے بنیاد الزام رکھا ہے۔

(۱) Pashalik de Baghdad

(۲) A Memoirs in the Mines de'l orient

[۲] براجس: صفحہ ۱۱۴-۱۰۶، برک ہارٹ: ۲، ۲۱۵-۲۰۰۔

[۳] صفحہ ۲۵۳-۲۵۱۔

خیریت یہ ہے کہ مترجم نے خود اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے[۵۱] - اور شاید اسی لئے کسی نے اُسے دہرایا نہیں۔ ہم نے یہاں صرف مخالفوں کی اوچھی حرکتوں اور احمقانہ افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس کا ذکر کر دیا، جو لوگ دروغ بیانی اور افترا پردازی میں اس حد تک جا سکتے ہیں، ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے -

---

[۵۱] حاشیہ: ۳-۳۵۱

چھٹا باب

ماخذ اور لٹریچر

(۱) تاریخ

(۱) روضۃ الافکار والافہام لمرتاد حال الامام وغزوات ذوی الاسلام

مصنفہ حسین بن غنام احسائی (ف ۱۲۲۵ھ)۔

یہ کتاب شیخ کی سیرت پر سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ مصنف شیخ کے شاگرد اور واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں ذاتی حالات، دعوت اور تبلیغی رسالوں کا ذکر ہے۔ بعض طویل رسالے پورے پورے اس میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ دوسری جلد جنگوں اور مختلف واقعات کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ترتیب سنہ وار ہے ۱۱۵۹ھ سے شروع ہو کر ۱۲۱۲ھ پر کتاب ختم ہوتی ہے۔ مطبع مصطفویہ بمبئی میں چھپی تھی (۱۳۳۷ھ) لیکن اس وقت گویا ناپید ہے۔ بروکلمن کو بھی اس مطبوعہ نسخے کا پتہ نہیں تھا۔ اس کا ایک نہایت اچھا قلمی نسخہ ندوۃ العلماء کے کتاب خانے میں ہے۔ ہمیں مطبوعہ نسخہ شرف الدین و اولادہ محمد علی روڈ بمبئی کی عنایت سے مستعار ملا جس کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں۔

(۲) عنوان المجد فی تاریخ نجد: مصنفہ عثمانؓ[1] بن بشر نجدی (ف ۱۲۸۸ھ)

مصنفؒ نے شیخ کے فرزندوں اور سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) کا زمانہ پایا ہے۔ کتاب کا آغاز شیخ کی سیرت اور ۱۱۵۸ھ کے واقعات سے ہوتا ہے پہلی جلد ۱۲۳۶ھ کے واقعات پر ختم ہوتی ہے، دوسری جلد ۱۲۶۷ھ کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے، مصنف نے شعبان ۱۲۷۰ھ میں کتاب کی تبییض سے فراغت حاصل کی۔

تفصیل اور واقعات کی تنقیح کے لحاظ سے، اُسے ابن غنام کی کتاب پر ترجیح حاصل ہے، —— پہلے بغداد میں ناقص چھپی تھی (۱۳۲۸ھ) ہمارے سامنے مطبعۂ سلفیہ مکہ مکرمہ کا طبع شدہ مکمل نسخہ ہے (۱۳۴۹ھ)۔

واقعات کی تدوین میں ہم نے زیادہ تر اعتماد انھیں دونوں کتابوں پر کیا ہے، شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ پر یہ دونوں کتابیں اصل اور اُم کا حکم رکھتی ہیں۔

(۳) ان دو کتابوں کے علاوہ ایک تیسری کتاب مثیر الوجد فی معرفۃ انساب ملوک نجد کا ذکر بھی آتا ہے، جو شاید ملوک نجد کی تاریخ میں اُصل، اور اور ماخذ کا کام دے سکے۔ بارد تمان[2] اور خیر الدین زرکلی[3] نے اس کا حوالہ دیا ہے، اُس کے مصنف رشید بن علی حنبلی۔ غالباً ابن بشر کے معاصر ہوں گے۔ افسوس کہ ہمیں

---

[1] بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۳۱) نے ابنِ بشر (ف ۱۲۸۸ھ) اور عثمان بن قائد النجدی الحنبلی (ف ۱۰۹۷ھ؛ السحب الوابلہ ورق ۸۸ ب) صاحب 'نجاۃ الخلف باعتقاد السلف' کے درمیان خلط کر دیا ہے۔

[2] مقالہ ابن سعود انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، [3] الاعلام: صفحہ ۳۶۸، ۵۵۸۔

یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔

(۴) عجائب الآثار فی التراجم والاخبار مصنفہ عبد الرحمٰن بن حسن جبرتی مصری (سنہ ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء - سنہ ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۲ء) اس کی ترتیب بھی سنہ وار ہے، سنہ ۱۱۰۰ھ کے حوادث سے شروع ہو کر سنہ ۱۲۳۶ھ کے حوادث پر ختم ہوتی ہے۔ محمد علی پاشا کے حملوں اور مصر و حجاز کی آویزش پر اس کی شہادت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مصر اور اس کے متعلقات میں، ہم نے جبرتی کے بیان کو ترجیح دی ہے۔ (مطبوعہ مصر: سنہ ۱۲۹۷ھ چار جلدوں میں)۔

(۵) خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام: مصنفہ احمد بن زینی دحلان مکی شافعی (سنہ ۱۲۳۲ھ - سنہ ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء)۔ اس کتاب میں اشرافِ مکہ کی مکمل تاریخ ہے بلکہ مکہ مکرمہ کے آخری دور کے حکام کی اتنی تفصیلی تاریخ مجھے اور کوئی نہیں ملی، اس لئے دحلان پہ عدم اعتماد کے باوجود، اشرافِ مکہ سے متعلق اس کے بیانات کو اہمیت دینا پڑی۔ یہ کتاب سنہ ۱۳۰۰ھ میں تالیف ہوئی۔ علامہ سید رشید رضا مرحوم نے الہدیۃ السنیہ کے حاشیہ (ص۲) میں لکھا ہے کہ

"یہ دعوت کے ظہور کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں مفتی تھے اور اپنے آقایان ولی نعمت کے چشم و ابرو کے اشارے پر اس جماعت کے متعلق غلط باتیں مشہور کیا کرتے تھے" —— انھوں نے غلط بیانی اپنے یقین و اعتقاد کی بناء پر کی ہو یا کسی کے اشارے پر؛ اس سے بحث نہیں۔ البتہ یہ کہنا غلط ہے کہ "یہ دعوت کے ظہور کے زمانہ میں مفتی تھے۔ سنہ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء میں درعیہ برباد ہوا، اور دعوت کا ظہور" سردست ختم ہو گیا تھا مفتی احمد زینی دحلان کے شباب میں مکہ مکرمہ میں شاید

کسی نجدی کا گذر بھی نہ ہوتا ہو۔

(۶) فتاوی و افادات عبد الوہاب الخ (مخطوطہ فارسی)۔ — یہ ایک مختصر سا قلمی رسالہ ہے، جس میں امیر عبد العزیز بن سعود (سنہ ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء - سنہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) کی طرف سے فتح علی شاہ قاچار (سنہ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء - سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کے نام ایک مکتوب اور بلاغِ عام ہے۔ اور آخر میں فتح علی شاہ کا جواب اور دھمکی ہے (مورخہ سنہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء: مخطوط مشرقی کتاب خانہ: فہرست انگریزی مشروح ص ۱۳۳۷)۔

(۷) البدر الطالع: محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانی (سنہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء - سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۲ء) کی البدر الطالع میں گو آلِ سعود کے متعلق صرف مختصر "تراجم" ہیں[۱] پھر بھی ان کی ایک قیمت ہے، کہ محدث شوکانی نے بڑی عمر پائی اور شیخ سے لے کر آلِ سعود کا عروج و زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(۸) تاریخ نجد: مصنفہ محمود شکری آلوسی (سنہ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء - سنہ ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء)۔ نجد کی مختصر تاریخ ہے، جس میں شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ کا بھی تذکرہ ہے معلومات عام طور پر صحیح ہیں۔ ابنِ غنام اور ابن بشر ان کے مآخذ ہیں، شیخ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات بھی اُن کے پیش نظر تھیں — مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۴۳ھ۔

(۹) الرحلۃ الحجازیۃ: مصنفہ محمد لبیب بتنونی۔ اس میں اشراف مکہ کی حکومت کا بیان مختصر اور مرتب ہے۔ غالباً ان کا زیادہ تر اعتماد دحلان کی خلاصۃ الکلام پر رہا ہے، محمد بن عبد الوہاب رح اور ان کی دعوت کا بھی ذکر ہے لیکن صحت روایت کا التزام نہیں (صفحہ ۷۳-۹۴) — مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ (طبع دوم)

---

[۱] البدر الطالع ۱: ۲۶۳؛ ۲: ۵۔

(۱۰) حاضر العالم الاسلامی (سنہ[1]: ص ۱۷۲-۱۶۱) تاریخ نجد الحدیث، کے عنوان سے امیر شکیب ارسلان نے شیخ اور آلِ سعود کے متعلق ایک الگ فصل اپنی کتاب میں دی ہے۔ ان کا ماخذ زیادہ تر غیروں کی کتابیں ہیں، اس لئے غلطیوں سے خالی نہیں پھر بھی غنیمت ہے۔ اور اس کے پڑھنے سے ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔

(۱۱) الزّہراء (رجب ۱۳۴۵ھ: ۳؛ ۷) محب الدین خطیب کا شیخ کی زندگی پر ایک مختصر اور جامع مقالہ۔ خطیب نے زیادہ تر ابنِ بشر اور ابنِ غنام سے اخذ کیا ہے، اس لئے بیانات مستند ہیں۔ ایک آدھ جگہ مثیر الوجد کا بھی حوالہ ہے۔ راقم نے کتاب کے پہلے باب میں اس مضمون سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ گو ان کے اصلی ماخذ بھی میرے سامنے تھے۔

(۱۲) اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی جزیرۃ العرب: محمد حامد فقی کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شیخ کی دعوت پر ہمدردانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ مصنّف کے تعلقات علمائے نجد سے بھی گہرے ہیں، اس لئے ان کی معلومات مستند اور ایک حد تک (official) بھی کہی جاسکتی ہیں۔ مگر افسوس کہ انھوں نے کہیں حوالہ نہیں دیا۔ عرب کے[2] معاصروں نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں، لیکن کسی نے تحقیق و تاریخ نگاری کا فرض ادا نہیں کیا۔ (مطبوعہ مصر: ۱۳۵۴ھ)۔ طوالت کے خوف سے ہر ایک پر الگ الگ تبصرہ نہیں کیا جاسکا۔

(۱۳) جزیرۃ العرب فی القرآن العشرین: مصنفہ حافظ وہبہ۔ یہ ایک جامع کتاب ہے اور اس کے مصنّف سلطان عبد العزیز بن عبد الرحمٰن آلِ سعود موجودہ فرمانروائے

---

[1] دوسرا ایڈیشن: قاہرہ سنہ ۱۹۳۲ء۔ [2] معاصروں میں امین ریحانی مشہور شامی عیسائی

نجد وحجاز کے معتمد علیہ ہیں۔ کتاب اچھی اور پر معلومات ہے۔ دعوت (صـ ۳۴۷-۳۱)

آلِ سعود (صـ ۱۷۷-۲۴۳) اور اخوان (صـ ۳۳-۳۱۱) پر بھی تین الگ فصلیں ہیں غلطیاں

بہت کم اور زیادہ تر سنین کی تطبیق کی ہیں۔ محمد بن سعود کی وفات کی تاریخ ۱۷۶۵ء

کی جگہ ۱۷۶۶ء دی ہے (صـ ۲۴۴) اسی طرح شیخ کی وفات ۱۷۹۱ء میں درج کی ہے

(صـ ۳۳۵) حالانکہ صحیح ۱۷۹۲ء ہے، اور بھی معمولی فروگذاشتیں ہیں، لیکن مجموعی حیثیت

سے کتاب غنیمت ہے۔

(۱۴) اتحاف النبلاء (فارسی) (صفحہ ۴۱۳ - ۴۱۶) نواب صدیق حسن خان

صاحب (ف: ۱۳۰۷ھ) نے اس کتاب میں بھی شیخ کا حال لکھا ہے۔ اور ایک حد تک

منصفانہ ہے۔ (مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ) (اس کے علاوہ التاج المکلل، موائد العوائد

وغیرہ میں بھی شیخ اور ان کی دعوت کا ذکر ہے)۔

(۱۵) ترجمان وہابیہ (اردو) اس رسالہ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب

نے جماعت کے متعلق عجیب متضاد اور بے جوڑ باتیں لکھی ہیں۔ غالباً وہ اپنے وقت کے

مخصوص حالات سے گھبرا گئے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

(مطبوعہ امرت سر: ۱۹۳۰ء)۔

(۱۶) سلاطین نجد کا مذہب (معارف: نومبر ۲۴ء) اس مختصر مقالے میں

(بقیہ حاشیہ صـ ۱۷۷) ادیب کی کتابوں کا بڑا غلغلہ ہے۔ ان کے انگریزی اور عربی اڈیشن

ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔ ان کی ملوک العرب ہماری نظر سے گزری۔ معلوم ہوا کہ ایک

اخبار نویس سے زیادہ ان کے معلومات کو وقعت نہیں دی جا سکتی۔ موجودہ جدید طرز کی انشا ہے

دلچسپی ہے، اگر مواد نہیں، تحقیق تو سرے سے مفقود ہے۔

استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ نے شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کا مختصر اور دلنشین خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کا تمہیدی حصہ خاص طور پر دل آویز ہے (جس کا ابتدائی ٹکڑا اس کتاب کا سرنامہ ہے)۔

(۱۷) تاریخ نجد: مصنفہ حافظ اسلم صاحب جیراج پوری۔ شیخ کی سیرت، دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ پر ایک مختصر اور سیدھی سادی کتاب ہے، زیادہ تر ابنِ غنام اور ابن بشر کی کتابیں ان کا مآخذ رہی ہیں۔ سادہ اور ہلکی پھلکی تاریخ کی حیثیت سے غنیمت ہے، گو غلطیوں سے خالی نہیں۔

(۱۸) سلطان ابن سعود: سلطان ابنِ سعود کی ـــــ سیرت سردار محمد صاحب حسنی بی۔ اے نے لکھی ہے۔ اس میں ایک باب شیخ کی دعوت (صفحہ ۴۵-۳۹) پر بھی ہے۔ آلِ سعود اور آلِ رشید کی تاریخ بھی دی گئی ہے (صفحہ ۷-۴۵) ان کا سارا مدار انگریزی کتابوں پر معلوم ہوتا ہے۔ عربی اور اسلامیات سے شاید ادنیٰ لگاؤ بھی نہیں۔ ان کی واقفیت کا عالم یہ ہے کہ مقرن کو مکرن اور مکران، مشاری کو مشعری، ثنیان کو طوہینان لکھتے ہیں (صٓ) اسی طرح عیینہ کو عیونیہ، الاحسا کو الحصا (ص۴۲) لکھا گیا ہے۔ تاریخی استناد کا عالم یہ ہے کہ محمد بن سعود کا سالِ وفات ۱۷۶۴ء (؟ ۱۷۶۵ء/۱۱۷۹ھ) اور عبدالعزیز بن سعود کی شہادت کی تاریخ ۱۸۰۲ء (؟ ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ) بتاتے ہیں۔

لہ مولوی اسمٰعیل صاحب غزنوی نے الہدیۃ السّنیہ کا اردو ترجمہ کیا ہے (جس کا ذکر آگے آتا ہے)۔ ترجمہ تو خیر جیسا بھی ہے۔ اس سے بحث نہیں، لیکن اُنھوں نے غضب یہ کیا، کہ حضرت سید صاحب مدظلہٗ کی پوری تمہید اپنے دیباچہ میں اس طرح پر نقل کر دی، گویا اُنھیں کی لکھی ہوئی ہے، اللہ ان کی اس لغزش کو معاف کرے۔

(صفحہ ۴۳-۴۴) سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مُصنّف کے بیان کے مطابق امام احمد بن حنبل نے موطا امام احمد حنبل مُرتب کی تھی (صفحہ ۴۵) ——— کوئی بتلاؤ ہم بتلائیں کیا؟-

جس شخص کے علم کا یہ عالم ہو اُسے سلطان ابنِ سعود کی سیرت لکھنے کی کیا ضرورت آپڑی تھی؟ ہم نے یہاں تاریخی لٹریچر کے ضمن میں اس کتاب کا ذکر صرف عبرت کے لئے کیا ہے ——— "وہابیوں" کے متعلق ان صاحب نے جو غلط بیانیاں کی ہیں (ص۲۶۲-۳) ان کے ذکر کی شاید اب ضرورت بھی نہیں۔

(۱۹) نی بور[1] کا سفرنامہ

Travels through Arabia and other countries in the East.

یہ سب سے پہلا یورپی سیاح ہے، جس نے نجد اور شیخ الاسلام کی دعوت پر اپنے سفرنامہ میں بحث کی۔ گو اس کا بیان بہت مختصر ہے (جلد دوم صفحہ ۱۳۶-۱۳۱)۔ پھر بھی اس لحاظ سے کہ یہ سب سے قدیم یورپی مآخذ ہے، قابل قدر ہے۔

نی بور اور اس کے رفقاء[2] ۱۷۶۱ء میں ڈنمارک سے روانہ ہوئے، اور ۱۷۶۲ء میں یمن پہنچے۔ لیکن چند مہینوں کے اندر اس کے رفقائے سفر سب فوت ہو گئے۔

---

[1] امیر شکیب ارسلان نے پورا نام (Caresten Nie Buhr) لکھا ہے۔ (ملحق تاریخ ابن خلدون: ص۷۷)۔

[2] نی بور کے رفیقوں میں ایک جرمن عالم زگن بھی تھا۔ امیر شکیب نے اس کے پوتے سے ملاقات کا ذکر کیا ہے (ایضاً)۔

لیکن چند مہینوں کے اندر اس کے رفقائے سفر سب فوت ہو گئے۔ صرف نی بور زندہ واپس ہوا (۱۷۶۵ء)۔ اس کا سفرنامہ عرب اور خاص کر یمن کے جغرافی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کے متعلق ایک اہم تاریخی اور جغرافی دستاویز ہے۔ اکثر مورخوں نے اس کے دقتِ نظر اور صحتِ بیان کی تعریف کی ہے۔[۵۱]

نی بور خود نجد نہیں جا سکا تھا، اس لئے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کی وجہ سے اس کا بیان فاش غلطیوں سے پاک نہیں رہ سکا ہے۔ اس کے بیان کی قیمت اس لئے بھی ہے کہ یہ شیخ کی زندگی میں بلادِ عرب پہنچا اور ایسے وقت کہ ابھی دعوت خوب پھیل بھی نہ سکی تھی۔ ریاض کی فتح ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ہوئی اور اس سے پہلے شیخ کا حلقۂ اثر محدود تھا۔ ہمارے پیشِ نظر نی بور کے سفرنامہ کا انگریزی ترجمہ ہے، مترجم کا نام (Robert Heron) ہے (مطبوعہ ایڈنبرا: ۱۷۹۲ء)۔

(۲۰) بادیا (Badia) جو علی بیگ عباسی کے نام سے ۱۸۰۷ء میں جدہ اترا، اور مکہ کی زیارت کی۔ مدینہ منورہ جانے سے اسے نجدی حکام نے روک دیا تھا۔ یہ پہلا یورپی سیاح ہے جس نے وہابی نجد اور اس کے پایۂ تخت درعیہ

---

[۵۱] ہوگارتھ: صفحہ ۶۴-۶۷؛ بلادِ عرب کے یورپی سیاحوں پر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب (لاہور) کا بھی ایک مختصر لیکن فاضلانہ مقالہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور میں نکلا تھا (اورنٹیل کالج میگزین مئی ۱۹۳۷ء: اگست ۱۹۳۷ء؛ دیارِ عرب کے مغربی سیاح) اور حقیقت میں سب سے پہلے اسی مقالے نے مغربی سیاحوں کے سفرناموں کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ اس کے بعد پروفیسر ہوگارتھ کی کتاب سے مزید روشنی ملی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ فلبی (ص ۲۶-۲۷) نے بھی نی بور کی اولیت اور اہمیت کا ذکر کیا ہے۔

کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے سفرنامے کا تاریخی حصہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس نے حجاز میں مصریوں کی مداخلت سے پہلے وہابیوں کی حکومت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک عینی شاہد کی معاصرانہ شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ افسوس کہ اس کا سفرنامہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔ ہم نے جہاں کہیں بھی اس کی شہادت نقل کی ہے، ہوگارتھ[1] کے واسطہ سے۔

(۲۱) برک ہارٹ کی کتاب (Notes on the Bedouins and the Wahhabys جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ - ۹۵۔

یہ مغربی سیاح ۱۸۱۴ء میں حجاز پہنچا۔ جب محمد علی پاشا نجدیوں کو حجاز سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور ۱۸۱۶ء میں مصر واپس ہوا، جہاں وہ تھوڑے عرصے کے بعد فوت ہو گیا۔ اس نے نجد، درعیہ اور بلادِ عارض کا مفصل اور محققانہ جغرافیہ دیا ہے، اس نے اپنے سفرنامے کی پہلی جلد (Travels in Arabia) میں مکہ معظمہ اور حج وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے، وہ اپنی جگہ پر نہایت مستند ہے۔ مکہ مکرمہ کے نظام حکومت پر بھی اس کی بحث عالمانہ ہے۔[2] رچرڈ برٹن، جس[3] نے ۱۸۵۰ء کے بعد مکہ و مدینہ کا سفر کیا،

---

[1] (Penetration of Arabia) صفحہ ۸۲ - ۷۸۔

[2] Travels etc.. ۱: ۴۴۴ - ۴۰۵۔

[3] کیپٹن سر رچرڈ برٹن (R. F. Burton) جس نے برک ہارٹ کے تقریباً چالیس برس بعد حجاز کا سفر کیا۔ لیکن اہلِ نجد کے متعلق کوئی اہم بات نہیں لکھی اس کے سفرنامہ کا ایک خاص ایڈیشن دو جلدوں میں بڑے آب و تاب سے چھپا ہے (لندن؛ ۱۸۹۳ء)

برک ہارٹ کا ثنا خواں ہے اور انتہائی ادعائے تحقیق کے باوجود برک ہارٹ کے بیانات پر کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ کر سکا۔[1]

اس کے سفرنامے کی پہلی دو جلدیں ۱۸۲۹ء میں چھپیں اور آخری دو جلدیں (Notes الخ) ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئیں۔ یہ چاروں جلدیں عرب اور اس کے جغرافیہ و متعلقات پر معلومات کا گنجینہ ہیں۔ ہمیں اس کتاب میں صرف (Notes on etc.) کی دوسری جلد سے بحث تھی۔ محمد علی مصری کے حملہ حجاز اور مصر و نجد کی لڑائیوں پر اس کے بیانات حد درجہ مستند اور عینی شہادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۲۲) براجس Harford jones Brydges کی کتاب

A Brief History of the Wahhabys

یہ شخص ایک برطانوی افسر کی حیثیت سے ۱۷۸۴ء میں بصرہ پہنچا اور ۱۷۹۴ء تک وہیں رہا۔ درمیان میں کچھ وقفہ کے بعد پھر بغداد میں اس کی تعیناتی ہوئی۔ جہاں ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۶ء تک اس کا قیام رہا۔ دونوں جگہوں۔ میں یہ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے تھا اور سعود بن عبد العزیز کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ براجس شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں بلادِ عرب آ گیا تھا اور سعود بن عبد العزیز کے اہم فتوحات کے زمانہ میں وہاں موجود تھا۔ اس لحاظ سے اس کی کتاب کی اہمیت اور تاریخی قیمت ہونا چاہئے مگر افسوس کہ اس میں دقتِ نظر نہیں۔ جابجا برک ہارٹ کی حرف بہ حرف نقالی کرتا ہے، جو اس کے بعد حجاز آیا اور پہلے مرا۔ یہ کتاب ۱۸۳۴ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اور برک ہارٹ کی کتابیں ۱۸۲۹ء

---

[1] ہوگارتھ: صفحہ ۸۹-۹۰

اور ۱۸۳۱ء میں نکل چکی تھیں۔ خود بھی اُسے برک ہارٹ کی خوشہ چینی کا اعتراف ہے۔ کہیں کہیں اس نے اضافہ بھی کیا ہے[۵۱] لیکن اہم واقعات حرف بہ حرف برک ہارٹ ہی سے لئے ہیں۔

(۲۳) پالگریو (W. Gifford Palgrave) کا سفرنامہ

(Narrative of a year's journey through central and Eastern Arabia)

یہ ایک کیتھولک عیسائی اور شہری زندگی کا عادی اور طبعاً ایک آرام پسند شخص تھا۔ ۱۸۶۲-۳ء میں اس نے عرب کی سیاحت کی۔ اُس نے حضری عربوں (حسا، قطیف وغیرہ کے باشندے) کی خوب تعریفیں کی ہیں لیکن اہلِ بادیہ کی ہمدردی کے لئے اس کے پاس ایک لفظ نہیں۔ اس نے اہلِ نجد شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے ماننے والو کی بڑی برائیاں کی ہیں، زویمر (حاشیہ ۱۹۸) اور ہوجس (صفحہ ۵۰ ب) کی رائے میں وہابیت کی برائی میں اس کی "کیتھلوکیت" کو بھی دخل تھا۔ زویمر کی رائے میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۲-۳ء کے واقعات میں اس کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں کسی مسئلہ کے متعلق صرف اس کے بیان پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ پیر

---

[۵۱] برک ہارٹ کا مرقع ۱۸۱۶ء کے وسط پر ختم ہو جاتا ہے۔ برانجس نے ایک اہم اضافہ یہ کیا ہے کہ اس نے محاصرہ درعیہ (۱۸۱۸ء) کی پوری تفصیل فرانسیسی مؤرخ (M. Mengin) کی تاریخ (History de l'Egypt Sous le Government de Mohammed Aly) (مصر کی تاریخ محمد علی کے عہد حکومت میں) سے حرف بہ حرف نقل کر دی ہے (ص ۱۶۱-۱۳۵)۔

اس نے جو کچھ لکھا ہے خرافات کا مجموعہ ہے (صفحہ ۳۸-۳۶۳) آل سعود کی تاریخ بھی (صفحہ ۸۷-۳۸) اسماء اور تاریخوں کی فاش غلطیوں سے پُر ہے - ہیوجس نے خوب لکھا ہے کہ "اس کے بیانات دلچسپ لیکن ناقابل اعتماد ہیں"[1] - زویمر کہتا ہے :-

"ایک کیتھولک سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ تجدید اور سلفیت کی دعوت کا ذکر اچھے انداز میں کرے گا۔"[2] نفسِ اسلام کے متعلق اس نے جو ہرزہ سرائیاں کی ہیں وہ انتہائی رکیک اور یکسر ناقابلِ اعتنا ہیں —— حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاصروں کی نشان دہی بھی صحیح نہیں کر سکا - شیخ عبدالرحمن بن حسن بن عبدالوہاب کو عبدالرحمن بن عبدالوہاب اور ان کے بیٹے عبداللطیف بن عبدالرحمن بن حسن کو عبدالرحمن بن عبداللہ کا بیٹا بتاتا ہے (ص ۳۷۹) اور مزید یہ کہ "عبداللہ بن عبدالوہاب (؟) درعیہ میں ابراہیم پاشا کے حکم سے قتل کر دئے گئے تھے" طرہ یہ ہے کہ وہ ریاض میں شیخ عبدالرحمن سے ملا بھی تھا۔ اس کا سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہے (۱۸۶۵ء) -

(۲۴) لیوس پلی کی - (A Political Mission to Nejd:)

یہ شخص بوشہر میں برطانی ریزیڈنٹ تھا۔ ۱۸۶۵ء میں فیصل بن ترکی (ف ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ) سے خلیج فارس کے ساحلی مقامات کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے ریاض آیا۔ ہمیں اس کی کتاب نہ مل سکی۔ ممکن ہے اس میں کچھ مواد ہو۔ ہیوجس نے اپنے ماخذ میں اس کی

---

[1] Notes etc., : صفحہ ۲۲۱ -

[2] حاشیہ: ص ۹۸

کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہوگارتھ[1] نے یوسف پلی کے مشن پر کافی بحث کی ہے اور اس کے سفر کی جغرافی قیمت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کی تاریخی تحقیقات کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

(۲۵) بیجر (G. Percy Bedger) کی (Imams and Syeds of Oman) یہ کتاب اصل میں ایک عربی مخطوطہ (مصنفہ سلیل بن رزیق) کا ترجمہ ہے، جس میں عمان کے امراء کی پوری تاریخ مفصل بیان کی گئی ہے (آغاز اسلام سے ۱۸۵۶ء تک)۔ بیجر نے انگریزی ترجمے میں حواشی اور ایک مبسوط مقدمہ کا اضافہ کیا ہے، جس میں کتاب کے پورے مواد پر بحث ہے اور عمان کی تاریخ بھی ۱۸۷۰ء تک مکمل کر دی گئی ہے۔

چونکہ آلِ سعود کی دعوت اور سیاسی عروج دونوں کا خلیج فارس اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام ساحلی علاقوں سے گہرا تعلق رہا ہے، اِس لئے ان کی تاریخ بھی جا بجا زیر بحث آئی ہے۔ بیجر کے حاشیے عام طور پر پُر معلومات اور اچھے ہیں، البتہ نجد کے متعلق وہ پالگریو پر زیادہ اعتماد کرتا ہے۔ آلِ سعود کے متعلق چونکہ زیادہ تر معلومات سیاسی نزاعوں اور حملوں کی تفصیل سے متعلق ہیں، اس لئے زیر نظر تالیف میں زیادہ فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا۔ (مطبوعہ لندن: ۱۸۷۱ء)۔

(۲۶) ڈاوٹی (Daughty) پالگریو کے تیرہ برس بعد ۱۸۷۵ء میں نجد آیا۔ بدوؤں کی معاشرت کی تفصیل جغرافی اور لسانی تحقیقات کے لحاظ سے اس کے سفر نامے کی جو بھی قیمت ہو، اہلِ نجد کی تاریخ پر اس نے کوئی خاص مسالہ نہیں چھوڑا، سوائے

---

[1] صفحہ ۳۱۰ - ۳۰۸۔

اس پیش گوئی کے:

"وہابی حکومت موت کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اور اب دوبارہ اس میں جان نہیں آسکتی۔۔۔۔۔ عام طور پر نجد میں یہی خیال ہے۔[۱]"

واقعات و مشاہدات نے اس خام خیالی کی تکذیب کر دی ۔۔۔ اس کا سفرنامہ Travels in Arabia Deserta دو جلدوں میں ہے (سنہ ۱۸۸۶ء اور سنہ ۱۹۲۱ء)۔

(۲۷) لیڈی اینی بلنٹ (Anne Blunt) کا سفرنامہ

A Pilgrimage to Nejd: مشہور سیاسی مدبر اور شاعر ولفرڈ سکاون بلنٹ Wilfrid Scawn Blunt اور ان کی بیگم لیڈی بلنٹ (جو مشہور شاعر بائرن کی پوتی تھیں) نے غالباً اچھے گھوڑوں کی تلاش میں عرب اور نجد کی سیاحت کی تھی (سنہ ۱۸۷۹ء)۔ لیڈی بلنٹ کے سفرنامے سے ہمارے موضوع کا تعلق نہیں۔ "دیباچہ" اور "ضمیمہ" جو خود ولفرڈ بلنٹ نے لکھا ہے، ان میں نجد کے جغرافیہ (دیباچہ VIII x x – ۱) اور "وہابیت کے عروج و زوال" کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ (۲: ۲۷۱-۲۵۱)۔ گو غلطیاں کافی ہیں، پھر بھی ایک "خاکہ" کی حد تک غنیمت ہے۔ کتاب میں جہاں کہیں بلنٹ کا حوالہ آیا ہے، یہی ضمیمہ مراد ہے۔ اصل سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہے (لندن سنہ ۱۸۸۱ء)۔

ولفرڈ بلنٹ کی "فیوچر آف اسلام" (صفحہ ۴۶-۴۲-۱۰۶) میں بھی شیخ کی دعوت کا ذکر آیا ہے۔ اس مختصر سے بیان میں بھی متعدد غلطیوں اور غلط فہمیوں کے نمونے

---

[۱] ۲: ۳۴۵۔

ملتے ہیں، جن کی طرف غلط بیانیوں کے ضمن میں اشارہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کا اگر کہیں حوالہ آیا ہے، تو کتاب کی تصریح کے ساتھ۔ ۱۸۹۲ء کا چھپا ہوا نسخہ ہمارے سامنے رہا ہے۔

(۲۸) ہیوجس (Thomas P. Hughes) کی ڈکشنری آف اسلام[۱] (Dictionary of Islam)

اس پروٹسٹنٹ مشنری کا یہ مقالہ کتنے مسلمان عالموں کی تحریروں سے بہتر ہے۔ جہاں تک دعوت کے منشاء کا تعلق ہے، اس نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس نے شیخ کی تعلیمات کا بہت اچھا خلاصہ دیا ہے۔ تاریخی فروگذاشتیں ہیں، سو وہ صدقہ ہیں برائجس اور بلنٹ کا —— اس کتاب میں جہاں کہیں ہیوجس (Hughes) کا حوالہ ہے یہی مقالہ مراد ہے۔ (نسخہ مطبوعہ لندن، ۱۸۸۵ء)

(۲۹) اسی ہیوجس کا دوسرا مقالہ (The Wahhabi) اس کی مختصر کتاب (Notes on Mohammadanism) میں (صفحہ ۲۲۶-۲۱۹) —— اس میں عام عقائد وغیرہ کے علاوہ سلاطین آلِ سعود کی بھی ایک مکمل فہرست دی گئی ہے۔ (۱۸۷۵ء تک) اس مختصر مقالے میں ڈکشنری آف اسلام والے مقالے (Wahhabis) پر کچھ مفید اضافے بھی ہیں، خاص کر ہندوستانی مجاہدین کے متعلق جن پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس مقالے کا جہاں حوالہ آیا ہے نوٹس کی تصریح کے ساتھ —— (نسخہ مطبوعہ: لندن ۱۸۷۷ء)۔

(۳۰) زویمر (zwemer) کی (Arabia, the cradle of Islam)

---

[۱] مقالہ وہابی (صفحہ ۶۶۲ - ۶۵۹)۔

زویمر نے اپنے تعصب کے باوجود شیخ کی دعوت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس تحریک سے قبل عرب کی حالت کا بھی صحیح جائزہ لیا ہے (ص ۱۹۲-۱۹۳) اپنی کتاب کے اس باب میں اُس نے صرف تین تاریخی غلطیاں کی ہیں،

(سنہ ولادت: ۱۶۹۱ء، سفر بغداد، ہدم قبہ رسول)۔ لیکن استنتاج میں اس کا تعصب غالب رہا، ارشاد ہوتا ہے:

"یہ تحریک اسلام کی تجدید تھی، گو بالکل ناکامی (Disaster) پر ختم ہوئی۔ اور سیاسی طور پر ایک شاندار ڈھونگ ثابت ہوئی" ص ۱۹۱-۲

(دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۲ء)

(۳۱) ہوگارتھ (David George Hogarth) کی (The Penetration of Arabia)

ہوگارتھ نے اس کتاب میں ان تمام یورپی سیاحوں کی کوششوں کا مفصل اور گہرا جائزہ لیا ہے، جنہوں نے گذشتہ تین صدیوں میں بلادِ عرب کی سیاحت کی اور وہاں کے جغرافیہ، تاریخ، اثریات، معاشرت، آداب و رسوم وغیرہ کے متعلق کوئی تحریری دستاویز یادگار چھوڑی۔ اس سلسلے میں ان سیاحوں کے کارناموں پر بھی پورا پورا تبصرہ ہوا ہے، جنہوں نے شیخ اور ان کے جانشینوں کے ایام حکومت میں بلادِ نجد و حجاز کی سیاحت کی۔ ہم نے ہوگارتھ کے مختلف بیانوں کا اصل سفرناموں سے بارہا مقابلہ کیا، لیکن اس کے نقل اور تبصرے میں کہیں ادنیٰ فروگذاشت نہیں پائی، اور اس لئے اصل سفرناموں کی عدم موجودگی میں اس کے خلاصہ اور تبصرے سے بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

(مطبوعہ: لندن سنہ ۱۹۰۴ء)

اس کتاب میں جہاں کہیں ہوگارتھ کا حوالہ ہے، یہی زیر نظر کتاب مراد ہے۔

ہوگارتھ کی ایک دوسری مختصر کتاب (A History of Arabia)

میں بھی اشرافِ مکّہ (ص ۹۳-۸۲) اور وہابی اور مصری (ص ۱۱۳-۹۹) پر دو باب ہیں، مگر حیرت ہوتی ہے کہ یہاں وہ محمد بن سعود، عبدالعزیز بن محمد بن سعود اور سعود بن عبدالعزیز کے درمیان ٹھیک ٹھیک فرق نہ کر سکا (ص ۱۰۳)۔

(۳۲) فلبی (H. St. J. B. Philby) کی کتاب (Arabia): مطبوعہ لندن: ۱۹۳۰ء

فلبی نے اس کتاب میں شیخ کی دعوت سے لے کر موجودہ سلطانِ نجد عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود (۱۹۳۰ء تک) نجد کی پوری تاریخ لکھی ہے، شیخ کی سیرت اور دعوت کا حصہ یکسر ابنِ غنام اور ابن بشر سے ماخوذ ہے[1]۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قیمتی معلومات کی حامل ہے۔ اور ہم نے اس سے کافی فائدہ اٹھایا ہے، لیکن اصل مآخذ کو سامنے رکھ کر — اس کتاب کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، مصنف کا مقصد یہ ہے کہ بلادِ عرب میں حکومت برطانیہ کو ایک "عصائے پیری" کی ضرورت ہے، اور اس کے لئے موجودہ فرماں روائے نجد زیادہ موزوں ہیں۔ شریف حسین کی امداد اور ابن سعود سے بے اعتنائی پر اس نے وہائٹ ہال، حکومت ہند اور حکومتِ بصرہ و بغداد پر سخت سے سخت تنقیدیں کی ہیں، خلاصہ یہ کہ جزیرۃ العرب میں برطانی

[1] فلبی نے خود بھی دیباچہ (ص ۔) میں لکھا ہے کہ یہ "پہلی کتاب ہے جو اصل مآخذ کی بنیاد پر انگریزی میں مرتب ہوئی ہے" اور اس کا لکھنا صحیح ہے۔ شیخ کے متعلق غالباً کسی مغربی زبان میں اتنی صحیح معلومات یکجا نہیں مل سکتیں۔

ڈپلومیسی پر یہ کتاب کافی روشنی ڈالتی ہے لیکن اس وقت ہمیں اس رُخ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔

(۳۳) مارد تمان (Mordtmann) کے مقالے دا ابن سعود اور ابن الرشید (مندرجہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام)۔

جرمن مستشرق، مارد تمان کے یہ مقالے اختصار کے باوجود جامع اور بڑی حد تک صحیح ہیں۔ سنین اور تاریخوں کی تعیین کی کوشش قابلِ تحسین ہے۔ اس سے پہلے تاریخوں کی ٹھیک ٹھیک تعیین اور ہجری اور عیسوی سنین کی تطبیق کا کسی نے التزام نہیں کیا، ہمیں کہیں کہیں اس سے اختلاف کرنا پڑا ہے۔ لیکن ابنِ سعود والے مقالے سے مدد بھی بہت ملی۔

(۳۴) مارگولیوتھ (D. S. Margoliouth) کے دو مقالے:

(i) وہابیہ: (Wahhabiyah) (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام)

(ii) وہابی: (Wahhabies) (انسائیکلو پیڈیا آف ریلجنز اینڈ اتھکس)

دونوں مقالے غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غلطیاں تو ہر کسی سے ہوتی ہیں لیکن ان صاحب کی ادا نرالی ہے۔ جہل مرکب اور غلطیوں کا انبار اتنا اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس کتاب میں جہاں صرف مارگولیوتھ کا حوالہ آیا ہے، پہلے مقالے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳۵) راونشا (T. E. Ravenshaw) کی یادداشت (Memorandum)— گو اس یادداشت کا تعلق مولانا احمد اللہ صادق پوری (ف ۱۲۹۸ھ) کے مقدمے اور ہندوستانی مجاہدین کی تحریک تجدید

وجہاد سے ہے، بایں ہمہ اس میں شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کی دعوت کے متعلق بھی خوب غلط بیانیاں کی گئی ہیں، جس کا ایک نمونہ گذر چکا (ملاحظہ ہو: اس کتاب کا پانچواں باب) —— یہ یادداشت پوری کی پوری کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے ضمیمے کی حیثیت سے چھپی ہے۔

(۳۶) ولیم ولسن ہنٹر (W. W. Hunter) کی

(The Indian Musalmans) مسلمانانِ ہند (مطبوعہ: ۱۸۷۱ء)[1]

اس کتاب کا تعلق بھی ہندوستانی مجاہدوں کی سرگرمیوں سے ہے، چونکہ یہ حضرات ہندوستان کی تحریک تجدید وامامت کو شیخ الاسلام ہی کی دعوت کا شاخسانہ بتاتے ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ انھیں شیخ کی دعوت پر بھی گفتگو کرنا پڑتی ہے[2]۔ اس سلسلہ میں ہنٹر صاحب نے بھی اپنی ناواقفیت کا خوب خوب ثبوت دیا ہے[3]۔ کچھ نمونے اوپر گذر چکے ہیں۔ ان "غلط بیانیوں" میں اس کا ماخذ زیادہ تر راونشا کی "یادداشت" رہی ہے گو یہ حوالہ نہیں دیتا۔

---

[1] اب یہ کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔ نظر ثانی کے وقت یہی نسخہ ہمارے سامنے ہے (کلکتہ: ۱۹۴۵ء)

[2] اس سلسلہ میں ہم نے جتنی کتابوں اور مقالوں کا ذکر کیا ہے، اُن سب میں نجد اور ہندوستان کی تحریکوں کو ایک بتایا گیا ہے۔ بعض صرف "اصول" کی حد تک ایک بتاتے ہیں، اور اکثر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد و تجدید کو شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی دعوت کی شاخ بتلاتے ہیں جو یکسر غلط ہے، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: راقم کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک")۔

[3] خاص طور پر ملاحظہ ہو: ص ۱۱ اور اس سے آگے (نیا اڈیشن)۔

(۳۷) (Andre Servier) کی (Islam and psychology of the Musalmans) (اصل فرنچ کا ترجمہ: لندن سنہ ۱۹۲۴ء)۔

ان صاحب نے محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت کو جی بھر کر گالیاں دی ہیں، اور یوں تو نفسِ اسلام ہی ان کے نزدیک "انسانیت کی ہر ترقی کا دشمن" ہے۔ (صفحہ ۲۶۴) — پالگریو ان کا ماخذ معلوم ہوتا ہے۔

(۳۸) (Wilson Cash) کی (The Expansion of Islam) (مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۶ء)۔

ان صاحب کا خیال ہے کہ محمد بن عبدالوہاب "عربی اسلام" چاہتے تھے (ص۱۹۱) اس قسم کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی کمی نہیں — ان دونوں کتابوں میں بھی شیخ کی دعوت کا ذکر ضمنی طور پر آیا ہے۔

(۳۹) رچرڈ کوک (Richard coke) کی (The Arab's Place in the sun) (صفحہ ۱۶۰-۱۶۱)۔

دعوت پر ایک اچھا مختصر تبصرہ ہے۔ غلطیاں بعض عام قسم کی ہیں، اور بعض ناموں کے الٹ پھیر سے ہوئی ہیں۔ سعود بن عبدالعزیز کے کارناموں کو یہ عبدالعزیز کی طرف منسوب کرتا ہے (صفحہ ۱۶۳) اور عبداللہ بن سعود اور سعود بن عبدالعزیز کے درمیان بھی ٹھیک ٹھیک فرق نہیں کر پاتا۔ (صفحہ ۱۶۳)۔

(۳۳ سے ۳۹ تک جن کتابوں کا ذکر کیا گیا، ان کی حیثیت ماخذ کی نہیں، بلکہ عام لٹریچر کی ہے۔ یہ فہرست اور طویل ہو سکتی تھی، لیکن اختصار کے خیال سے اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ بعض کتابوں کے ضمنی حوالے اصل کتاب میں آ گئے ہیں جیسے

استاڈرڈ (Lothrop Stoddard) کی جدید دنیائے اسلام (The New World of Islam) وغیرہ۔

(۲) مذہبی

(الف)

توحید اور انکارِ بدعات پر سینکڑوں، ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں گی اور ان کا استقصا مشکل بھی ہے۔ خاص طور پر امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اور اُن کے شاگردِ رشید امام ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی کتابیں ان مباحث سے بھری پڑی ہیں۔ ہم یہاں صرف ان کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کے مطالعہ کا اس دوران میں، ہمیں موقع ملا اور شیخ کی دعوت کے سمجھنے میں اُن سے مدد ملی۔

(۱) الباعث علی انکار البدع والحوادث لابی محمد عبدالرحمٰن بن اسمٰعیل بن ابراہیم ابی شامۃ المغربی (ف ۶۶۵ھ) — (مطبوعہ مصر: ۱۳۱۰ھ)

(۲) تجرید التوحید المفید للشیخ تقی الدین احمد بن علی المقریزی (ف ۸۵۴ھ) (مصر ۱۳۴۳ھ)

(۳) تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد لمحمد بن اسمٰعیل الامیر الیمنی الصنعانی (ف ۱۱۸۲ھ) (مصر: ۱۳۴۰ھ)

(۴) کتاب التوحید لمحمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) (مطبوعہ: ۱۳۴۴ھ مع تعلیقات استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی۔

اور شیخ کی دوسری تصنیفیں اور رسالے۔

(۵) الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید لمحمد بن علی الشوکانی (ف ۱۲۵۰ھ)

(مصر ۱۳۴۳ھ)

اس کا اردو ترجمہ بھی مولوی محمد علی صاحب قصوری ایم۔اے کے قلم سے چھپ گیا ہے۔ (۱۹۲۴ء)

(۶) التحف فی مذاہب السلف الشوکانی۔ مصر ۱۳۱۰ھ۔

(۷) مجموعۃ الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ، مرتبہ سلیمان بن سمحان نجدی۔

اس مجموعہ کے مرتب نجد کے مشہور علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل الشیخ (ف ۱۲۸۵ھ) اور شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن حسن (ف ۱۲۹۲ھ) دونوں سے استفادہ کیا۔ چھیاسی سال کی عمر میں وفات پائی (۱۳۵۸ھ) بروایت شیخ عمران نجدی)۔

اس مجموعے میں حسبِ ذیل رسالے ہیں:۔

(الف) الرسالۃ الدینیۃ فی معنی الالٰہیۃ (ص ۳۔۲۰) للامیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود (ف ۱۲۱۸ھ)

(ب) شئی من سیرۃ الشیخ وتوالیمہ (ص ۲۰۔۲۸) للشیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن آل الشیخ (ف ۱۳۰۰ھ)

(ج) الرسالۃ الثالثۃ (ص ۵۵۔۴۱) للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب۔

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ اوکنلی (J. O' Kinely) کے قلم سے جنرل ایشیاٹک سوسائٹی میں شائع ہوا۔ (۱۸۷۴ء: ۱ ص ۶۸۔۸۲) ترجمہ میں بعض مضحکہ انگیز غلطیاں بھی ہیں۔ جیسے الامہات الستۃ (حدیث کی چھ اہم کتابیں: صحاح ستہ) کا ترجمہ اس نے (Six mothers) کیا ہے (ص ۷۴) وغیرہ وغیرہ۔

یہ رسالہ ۱۲۱۸ھ میں اہلِ مکہ مکرمہ کی تعلیم کے لئے لکھا گیا جب سعود بن عبد العزیز پہلی مرتبہ حرم میں فاتحانہ داخل ہوا۔

(د) الفواکہ العذاب فی الرد علی من لم یحکم السنۃ والکتاب (ص ۹-۵۵) للشیخ احمد بن ناصر بن عثمان المعمری النجدی (ف ۱۲۲۵ھ)۔

یہ رسالہ ۱۲۱۱ھ میں تالیف ہوا، جب شیخ احمد بن ناصر امیر عبد العزیز کی طرف سے حجاز بھیجے گئے اور رجب ۱۲۱۱ھ میں علمائے حرم سے مناظرہ ہوا۔

(ھ) الرسالۃ الخامسۃ (ص ۹۹-۹۱): للشیخ محمد بن عبد اللطیف بن عبد الرحمٰن آل الشیخ۔

یہ رسالہ ۱۳۳۹ھ میں تالیف ہوا۔ مصنف بقید حیات ہیں عمر اسی کے لگ بھگ ہوگی۔ (بروایت شیخ عمران نجدی)

ان رسالوں کا ترجمہ اُردو میں ہوگیا ہے (از مولوی اسمٰعیل صاحب غزنوی) (۲۷ء)۔

آخر میں کچھ قصیدے ہیں (ص ۱۱۲-۱۰۱)

(۸) فتح المجید شرح کتاب التوحید: تالیف الشیخ عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ طبع سوم: قاہرہ ۱۳۵۷ھ)

(۹) جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین: للشیخ نعمان خیر الدین الالوسی (ف ۱۳۱۷ھ) (بولاق: ۱۲۹۸ھ)

یہ کتاب مجھے بہت مفید اور جامع معلوم ہوئی اور اس لئے میں نے اسے بار بار پڑھا۔ علامہ سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۳ھ) نے بھی اپنی خودنوشت سوانح

حیات میں اس کی بہت تعریف کی ہے (ملاحظہ ہو: معارف: نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۶ء)۔

(۱۰) الاعتقاد الرجیح فی شرح الاعتقاد الصحیح للنواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ)

(بولاق: ۱۲۹۸ھ علی ہامش جلاء العینین)۔

(۱۱) تنبیہ ذوی الالباب السلیمۃ عن الوقوع فی الالفاظ المبتدعۃ الوخیمۃ: لسلیمان بن سحمان النجدی (ص ۸۰-۱)

(۱۲) تبرئۃ الشیخین الامامین من تزویر اہل الکذب والمین: لسلیمان بن سحمان (ص ۸۲-۲۱۵)۔

یہ دونوں رسالے ایک ساتھ چھپے ہیں (مصر: ۱۳۴۲ھ)

(ب)

(۱۳) کتاب التوضیح عن توحید الخلاق فی جواب اہل العراق للشیخ سلیمان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب (ش: ۱۲۳۳ھ)

(مصر: ۱۳۱۹ھ)

(۱۴) منہاج التقدیس والتاسیس فی کشف شبہات داود بن جرجیس: للشیخ عبد اللطیف بن عبد الرحمن بن آل الشیخ (ف ۱۳۰۴ھ)

(بمبئی: ۱۹۰۷ء)

یہ صلح الاخوان کا جواب ہے

(۱۵) صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان: للشیخ محمد بشیر السہسوانی (ف ۱۳۲۶ھ)

یہ کتاب عام طور پر مولانا محمد بشیر سہسوانی ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے[1] ہمارے

---

[1] ملاحظہ ہو: تراجم علمائے حدیث ہند، جلد اول ص ۲۵۵

پاس جو نسخہ ہے، اس پر مصنف کا نام عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم السندی درج ہے۔ غالباً یہ کسی مصلحت سے کیا گیا تھا۔

(یہ وہی نسخہ ہے جو شیخ اسحٰق بن عبدالرحمٰن بن حسن کے استعمال میں رہا ہے) (مطبع فاروقی دہلی: ۱۸۹۰ء)

اس کا دوسرا ایڈیشن نہایت تصحیح واہتمام سے المنار پریس مصر میں چھپا ہے (۱۳۵۱ھ) اور اصل مصنف کی طرح نسبت کی گئی ہے۔ آغاز میں علامہ سید رشید رضا (ف ۱۳۵۳ھ) کا مقدمہ اور تعارف ہے۔

(۱۶) البیان المبدی لشناعۃ القول المجدی: لسلیمان بن سحمان النجدی

صیانۃ الانسان، دحلان کے الدرر السنیۃ کا جواب ہے۔ جواب الجواب القول المجدی فی الرد علی عبداللہ بن عبدالرحمٰن السندی کے نام سے شائع ہوا۔ البیان المبدی، القول المجدی کی تردید میں ہے (امرتسر: ۱۸۹۷ء)

(۱۷) الصواعق الالٰہیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: لسلیمان بن عبدالوہاب النجدی الحنبلی (ف ۱۲۰۸ھ)

یہ رسالہ شیخ الاسلام کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب کا لکھا ہوا ہے۔ اوپر گذر چکا ہے، کہ یہ بعد کو تائب ہو گئے تھے (۱۱۹۰ھ۔ ابن غنام ۲، ۱۰۸)۔۔۔ مخالف اس رسالے کا تو خوب ڈھول پیٹتے ہیں لیکن "رجوع" کا ذکر نہیں کرتے۔ کتاب کا یہ نام غالباً بعد کو رکھا گیا ہے اس لئے کہ سلیمان بن عبدالوہاب نے یہ رسالہ ۱۱۶۷ھ کے لگ بھگ ایک

خط کی صورت میں لکھ کر اہلِ حریملا کے پاس بھیجا تھا، جس کا جواب بھی شیخ نے دیا تھا۔[۵۱] اور ۱۱۶۷ھ میں یہ نام (وہابیۃ) قطعی طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ (مطبوعہ مصر: ندارد[۵۲])

اصل رسالہ تو مختصر ہے، لیکن اس میں کچھ ضمیمے بھی لگا دئے گئے ہیں، اور یوسف وجوی وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ "ضمیمے" اکثر و بیشتر ابن سعود کے عروج کے بعد تالیف کئے گئے ہیں۔

(۱۸) تہکم المقلدین* فی مدعی تجدید الدین: لمحمد بن عبد الرحمٰن بن عفالق الاحسائی (تقریباً ۱۱۷۰ھ)

(۱۹) الفصل الخطاب فی رد ضلالات ابن عبد الوہاب: لاحمد القبانی البصری (تقریباً ۱۱۷۰ھ)

(۲۰) الصواعق والرعود: لعفیف الدین عبد اللہ بن داؤد الزبیری الحنبلی (ف ۱۲۲۵ھ) مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ: ۱۲۳۸ھ)۔

(۲۱) مصباح الانام و جلاء الظلام للسید احمد عبد اللہ الحداد با للوی (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ ۱۲۵۸ھ)

(۲۲) *تحلیح الاخوان من اہل الایمان و بیان الدین القیم فی تبرئۃ ابن تیمیہ و ابن قیم لداؤد بن سلیمان ابن جرجیس البغدادی (ف ۱۲۹۹ھ)۔

اسی کی تردید میں شیخ عبد اللطیف کی منہاج التقدیس لکھی گئی تھی۔ (بمبئی ۱۳۰۵ھ) نعمان آلوسی (ف ۱۳۱۷ھ) نے بھی جلاء العینین (ص ۳۱۵) میں مصنف صلح الاخوان کی غلط بیانیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۲۳) الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: السید احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ)۔

یہ چھوٹا رسالہ ہے، جو دحلان کی خلاصۃ الکلام میں بھی پورا پورا آگیا ہے (ص ۲۲۸-۲۶۱)۔

اس کے جواب میں مولانا محمد بشیر سہسوانی نے صیانۃ الانسان لکھی اور پھر اس پر حضرمی نے القول المجدی تصنیف کی۔ آخر میں سلیمان بن سحمان نے البیان المبدی لکھی۔ آخر دور میں یعنی گذشتہ ساٹھ ستر سالوں میں مفتی دحلان ہی کی کتابوں نے غلط بیانیوں کی زیادہ اشاعت کی ہے۔

---

[۵۱] روضۃ الافکار: ۲، ۲۳-۵۲۔ [۵۲] ۱۳۲۰ھ کے بعد چھپی ہے۔ اتنا قطعی ہے۔ [۵۳] مولف مصباح الانام (جو تیرھویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے) نے دیباچہ میں ایسی متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے جو شیخ کی تردید میں لکھی گئی تھیں، لیکن ان کا ذکر کسی فہرست میں نہیں جیسے: (۱) الصارم الہندی فی عنق النجدی للشیخ عطا المکی۔ (۲) رسالۃ للشیخ احمد المصری الاحسائی۔ مصباح الانام طبع بھی ہو چکی ہے (بر دھلی: ۲، ۸۱۳) *جن کتابوں پر یہ علامت ہے، وہ مجھے دستیاب نہ ہو سکیں۔

(د)

(۲۴) فتح المنان فی ترجیح الراجح وتزییف الزائف من صلح الاخوان لمحمد بن ناصر الحازمی النجدی (ف سنہ ۱۲۸۳ھ)۔
یہ آخری کتاب بطور محاکمہ کے لکھی گئی ہے، جیساکہ کتاب کے نام اور اتحاف کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے۔

چونکہ ان میں سے اکثر کتابوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس لئے مآخذ کے سلسلے میں مزید تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یوں کافی چھان بین کی جائے، تو یہ فہرست طویل ہو سکتی ہے۔[۲]

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

---

* جن کتابوں پر یہ علامت ہے، وہ مجھے دستیاب نہ ہو سکیں۔

[۱] اتحاف النبلاء: ص ۱۳۴

[۲] ان کتابوں کے علاوہ ضمنی طور پر مندرجہ ذیل تذکروں سے بھی سنین وفات اور دوسری تفصیلات کی تعیین میں بڑی مدد ملی:۔

(i) سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر للمرادی

(ii) السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ (مخطوطہ مشرقی کتب خانہ) ——— اس کا مصنف بھی شیخ کی اور ان کی دعوت کی مذمت میں حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔

(iii) معجم المطبوعات (سرکیس)

(iv) الاعلام للزرکلی (تین جلدیں)

(v) جرمن مستشرق (C. Brockelmann) کی مشہور تاریخ ادب عربی (Geschichte der Arabischen Litterature) (دو جلدیں: سنہ ۱۸۹۸ء ذیل کی دو جلدیں: سنہ ۱۹۳۸ء)

خاص کر ذیل کی دوسری جلد تو اس سلسلے میں اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔

(۸) تقویم ہجری و عیسوی (انجمن ترقی اردو)